فہرست

شذرات	کشمیر کا زلزلہ ـــــ قیامت کی یاددہانی	منظور الحسن	۲
	زلزلۂ قیامت	ریحان احمد یوسفی	۷
	زلزلہ محض اتفاقی حادثہ یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے انتباہ	〃 〃	۱۱
قرآنیات	آل عمران (۳: ۱۳۰۔۱۳۶)	جاوید احمد غامدی	۱۵
معارف نبوی	قریش کی حکمرانی سے متعلق روایات	معز امجد	۱۹
	حضرت مسیح کا مقام	طالب محسن	۲۸
	دین آسان ہے	ساجد حمید	۳۲
نقطۂ نظر	ام الکتاب، کتاب مکنون، لوح محفوظ	پروفیسر خورشید عالم	۴۱
اصلاح و دعوت	بدگمانی کیا ہے، اس سے کیسے بچیں؟ (۲)	ساجد حمید	۴۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظورالحسن

کشمیر کا زلزلہ ـــــ قیامت کی یاددہانی

إِذَا زُلْـزِلَـتِ الْأَرْضُ زِلْـزَالَهَا :''جب زمین ہلادی جائے گی جس طرح اسے ہلانا ہے۔'' وَأَخْـرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا:''اورزمین اپنے سب بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی۔'' وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا:''اورانسان کہے گا:اس کوکیا ہوا؟'' يَـوْمَـئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ، بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَى لَهَا :''اس دن، تیرے پروردگار کے ایما سے، وہ اپنی سب کہانی کہہ سنائے گی۔''

یہ 'زَلْـزَلَةُ السَّـاعَةِ' ہے۔اس کاایک دن مقرر ہے۔وہ دن،''جب صور میں ایک ہی مرتبہ پھونک ماری جائے گی،اورزمین اور پہاڑوں کوایک ہی مرتبہ اٹھا کر پاش پاش کر دیا جائے گا''؛''جب سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی''؛''جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی''؛''جب چاند گہنائے گا''؛''جب تارے بکھر جائیں گے''؛''جب سمندر ابل پڑیں گے''؛...''تو اس دن ہونے والی ہو جائے گی''۔''اس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔''

یہ قیامت کا زلزلہ ہے۔اسی کی یاددہانی ہے جوابراہیم وموسیٰ، مسیح ومحمد اور دیگر انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اپنے زمانوں میں کی ہے،تورات، زبوراور انجیل اسی سے خبردار کرتی رہی ہیں اورقرآن کی صورت میں پروردگار عالم کا آخری صحیفہ چودہ صدیوں سے اسی کی منادی کرر ہا ہے۔ـــــ کشمیر کا زلزلہ بھی اسی کی یاددہانی ہے۔

اس دن، زندگی رواں دواں تھی۔لوگ معمولات میں سرگرم تھے۔یک بیک زمین میں جنبش ہوئی، پہاڑ ڈگمگائے، درخت اکھڑے، چٹانیں ٹوٹیں، دیواریں گریں اور پھر پلک جھپکتے میں بستیوں کی بستیاں اپنی بنیادوں پر اوندھی ہو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

گئیں۔ کشمیر کی وادی کے قریباً نصف لاکھ لوگ لمحے بھر میں موت کی وادی میں اتر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرنے والوں میں شیر خوار بھی تھے، کم سن بھی تھے، جوان بھی تھے اور سن رسیدہ بھی۔ یہ دنیا سے رخصت ہوئے، ان کی زندگی کا سفر پورا ہوا، مہلت عمر ختم ہوئی اور عرصۂ آزمایش مکمل ہو گیا۔ دنیا کی کھیتی میں انھوں نے جو بونا تھا، بو لیا، اس کا ثمر اب انھیں آخرت میں جنت یا دوزخ کی صورت میں پانا ہے۔ یوم قیامت یہ دوبارہ جئیں گے اور اعمال کی جواب دہی کے لیے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے۔

یہ مرگ انبوہ اصل میں وہی موت ہے جو اللہ کے حکم سے فرداً فرداً ہر روز نافذ ہوتی ہے۔ کرۂ ارض کے ہر خطے میں اس کا مظاہرہ جاری ہے۔ طبعی اسباب، وبائی امراض اور حادثات کے نتیجے میں لاکھوں لوگ ہر لمحہ لقمۂ اجل بن رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ روزمرہ کا واقعہ ہے کہ ہم اپنے ہم نفسوں کے لاشے اپنے کندھوں پر اٹھاتے اور اپنے ہاتھوں سے زمین میں دفن کرتے ہیں۔ انفرادی اموات کے یہ واقعات درحقیقت قیامت ہی کی تذکیر کرتے ہیں، مگر ہم انھیں معمول کے واقعات سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور قیامت سے غافل رہ کر دنیا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہی غفلت ہے جس سے انسانوں کو بیدار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ایک ہی علاقے کی کثیر تعداد پر بیک وقت موت نافذ کر دیتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اگر ہم غور کریں تو زلزلے کی صورت میں قیامت کی یہ تنبیہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے عالمی سطح پر برپا ہوئی ہے۔ دنیا بھر کے لوگوں کو اس کی خبر بھی پہنچی ہے اور انھوں نے اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ اگر ان کی آنکھیں بینا ہوں، کان شنوا ہوں، حواس بیدار ہوں تو وہ اس حادثے کی خبر سے قیامت کی خبر کی طرف متوجہ ہو سکتے اور یہ جان سکتے ہیں کہ روز قیامت ایسا زلزلہ آئے گا جو پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ایک ہی مرتبہ تمام انسانوں پر موت طاری ہو گی۔ وہ خاک میں مل کر خاک ہو جائیں گے۔ پھر وہ بھی جو قیامت کے حادثے کا شکار ہوئے اور وہ بھی جو اس سے پہلے اپنی اپنی زندگی بسر کر کے دنیا سے رخصت ہوئے، دوبارہ جی اٹھیں گے۔ اس حال میں میدان حشر میں جمع ہوں گے کہ ان کے ہاتھوں میں اعمال نامے ہوں گے جن میں ان کی زندگی بھر کے اچھے اور برے اعمال درج ہوں گے۔ عدالت لگے گی۔ ہر شخص پروردگار کے حضور میں پیش ہو گا۔ جن لوگوں کے نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے، انھیں جنت کی ابدی زندگی کا انعام ملے گا اور جن کے گناہوں کے پلڑے بھاری ہوں گے، وہ جہنم کی سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

اس تنبیہ اور اس یاد دہانی کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ پروردگار کی طرف سے ایک آزمایش بھی ہے۔ صبر کی آزمایش

اور شکر کی آزمایش۔ صبر کی آزمایش ان لوگوں کے لیے ہے جو اس حادثے سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان متاثرین میں وہ بھی ہیں جن کے عزیز ان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہیں، وہ بھی ہیں جنھیں اب تا عمر معذوری کی زندگی بسر کرنی ہے ، وہ بھی ہیں جن کے گھر تباہ ہو گئے ہیں اور وہ بھی ہیں جن کے روزگار کے ذرائع ختم ہو گئے ہیں۔ وہ سب اگر اس واقعے کو صبر کا امتحان سمجھتے اور اسے اپنے پروردگار کے ایک حکم کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں اور اس کے حضور میں جزع فزع کرنے کے بجائے اور یاس میں مبتلا ہونے کے بجائے استحکام اور ثابت قدمی کے ساتھ اس سانحے کو جھیل جانے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے مالک کی طرف سے صبر کی آزمایش میں پورے اترے ہیں۔ انھیں اپنے پروردگار پر پورا بھروسا رکھنا چاہیے۔ ان کا پروردگار ان مصائب اور ان محرومیوں کے بدلے میں انھیں اس قدر زیادہ دے گا کہ وہ نہال ہو جائیں گے۔

محفوظ رہنے والوں کے لیے یہ حادثہ شکر کی آزمایش ہے۔ خدا اگر چاہتا تو وہ بھی اس حادثے یا اس جیسے کسی دوسرے حادثے کا شکار ہو جاتے۔ اس نے اگر انھیں محفوظ رکھا ہے تو یہ ان کا استحقاق نہیں ہے، بلکہ ان کے مالک کی کرم نوازی ہے۔ اس کرم نوازی کا حق یہ ہے کہ وہ اللہ کے حضور سراپا شکر بن جائیں۔ شکر کے اظہار کے لیے ان کا عمل دو پہلووں سے نمایاں ہونا چاہیے۔ ایک اس پہلو سے کہ وہ اس واقعے کو قیامت کی یاددہانی تصور کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی میں انقلاب کا پیش خیمہ بنا لیں۔ ماضی کی کوتاہیوں پر توبہ واستغفار کریں اور مستقبل کے بارے میں یہ فیصلہ کریں کہ انھیں بقیہ زندگی صرف اور صرف اپنے پروردگار کی خوشنودی کے لیے بسر کرنی ہے۔ اپنے اندر یہ شعور پیدا کریں کہ دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے، اپنے شب و روز کو اسی کے لیے مختص کر دینا خسارے کا سودا ہے۔ اس کے مقابل میں اخروی زندگی لافانی ہے، نفع کا سودا یہی ہے کہ اپنے معمولات کو اسی کی کامیابی کے لیے خاص کیا جائے۔

اظہار تشکر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اس حادثے کے متاثرین کے لیے سراپا ایثار بن جائیں۔ ان کی ہمت بڑھائیں، ان کے لیے علاج، خوراک، لباس اور رہایش کا بندوبست کریں اور اپنے مالوں میں سے ان کے لیے دل کھول کر خرچ کریں اور خدا کے اس فرمان کو یاد رکھیں:

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ، فَيَقُوْلَ: رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ، فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ. (المنافقون۶۳:۱۰)	’’اور ہم نے جو روزی تمھیں دی ہے، اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس وقت وہ کہے کہ پروردگار، تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی کہ میں خیرات

کرتا اور (اِس کے نتیجے میں) تیرے نیک بندوں میں
شامل ہو جاتا۔''

یہ حادثہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا سرتا سر قیامت کی یاددہانی ہے، مگر ہمارے ہاں بالعموم اسے عذاب الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ یہ تعبیر قرآن وسنت کے بالکل خلاف ہے۔ عذاب الٰہی کے معنی اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی سزا کے ہیں اور یہ تازیانہ ظاہر ہے کہ انھی لوگوں پر برستا ہے جن کی فرد قرارداد جرم متعین ہوتی ہے، جن کے پاس مدافعت کے لیے کوئی عذر نہیں رہتا، جو پروردگار کی عدالت میں پیش کیے جاتے ہیں اور وہاں سے مجرم قرار پا کر سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ عامۃ الناس کے لیے یہ عدالت قیامت میں لگنی ہے اور اسی موقع پر ان کی جزا و سزا کا فیصلہ ہونا ہے۔ چنانچہ ایسے حادثات کا شکار ہونے والوں کے بارے میں یہ کہنا کہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا ہے، کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ البتہ، تاریخ انسانی میں متعدد مواقع ایسے آئے ہیں جب پروردگار کی عدالت زمین پر قائم ہوئی ہے اور اس کے فیصلے کے نتیجے میں بعض اقوام پر اللہ کا عذاب نازل ہوا ہے۔ اس عذاب کی کیا حقیقت اور کیا نوعیت ہے، اس کے بارے میں استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی نے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو خلق کی ہدایت کے لیے مبعوث فرماتے ہیں اور اپنی طرف سے وحی والہام کے ذریعے سے ان کی رہنمائی کرتے ہیں، انھیں نبی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہر نبی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ رسول بھی ہو۔ رسالت ایک خاص منصب ہے جو نبیوں میں سے چند ہی کو حاصل ہوا ہے۔ قرآن میں اس کی تفصیلات کے مطابق رسول اپنے مخاطبین کے لیے خدا کی عدالت بن کر آتا ہے اور ان کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ رسولوں کی دعوت میں یہ فیصلہ انذار، انذار عام، اتمام حجت اور ہجرت و برأت کے مراحل سے گزر کر صادر ہوتا اور اس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہو جاتی ہے، خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا ہے اور رسول کے مخاطبین کے لیے ایک قیامت صغریٰ برپا کر دی جاتی ہے۔ اس دعوت کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں کم ہوتے ہیں اور اسے کوئی دار الہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ معتد بہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اس کے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کسی سرزمین میں اس کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتے ہیں۔ ان دونوں ہی صورتوں میں رسولوں سے متعلق خدا کی وہ سنت لازماً روبہ عمل ہو جاتی ہے جو قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗٓ، ''بے شک، وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اُولٰٓئِكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ. كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ. (المجادلہ۵۸: ۲۰۔۲۱)

مخالفت کر رہے ہیں، وہی ذلیل ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب رہیں گے۔ بے شک، اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔''

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑ دینے کے بعد یہ ذلت اس طرح مسلط کی جاتی ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل ہوتیں، ساف وحاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح، قوم لوط، قوم صالح، قوم شعیب اور اس طرح کی بعض دوسری اقوام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اس سے مستثنیٰ صرف بنی اسرائیل رہے، جن کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سیدنا مسیح علیہ السلام کے ان کو چھوڑنے کے بعد ان کی ہلاکت کے بجائے ہمیشہ کے لیے مغلوبیت کا عذاب ان پر مسلط کر دیا گیا۔

دوسری صورت میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں قوم کو مزید کچھ مہلت مل جاتی ہے۔ رسول اس عرصے میں دار الہجرت کے مخاطبین پر اتمام حجت بھی کرتا ہے، اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے بعد انھیں اس معرکۂ حق و باطل کے لیے منظّم بھی کرتا ہے اور دار الہجرت میں اپنا اقتدار بھی اس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اس کی مدد سے وہ منکرین کے استیصال اور اہل حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہی دوسری صورت پیدا ہوئی۔'' (اصول و مبادی ۵۴)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ یہ عذاب رسولوں کے براہ راست مخاطبین کے ساتھ خاص ہے اور ختم نبوت کے بعد اس کا دروازہ اب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

زلزلۂ قیامت

[پاکستان کی تاریخ کے بدترین زلزلے میں ہونے والی تباہی نے جہاں ہر دل کو افسردہ کر دیا ہے، وہاں ذہن میں بہت سے سوال ہیں جو خود اللہ تعالیٰ اور اس دنیا کے ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ مضمون انھی سوالوں کا جواب ہے۔ یہ مضمون کشف و الہام پر نہیں، قرآن و حدیث کے محکمات پر مبنی ہے۔ تاہم تمثیلی اسلوب اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ دلوں کے قریب ہوتا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ ماہ اکتوبر کی آٹھ تاریخ ہے۔ صبح کے آٹھ بج چکے ہیں۔ ہفتہ کا دن ہے۔ بائیبل کہتی ہے کہ اس دن کائنات کو بنانے کے بعد خداوند نے آرام کیا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ خداوند پاک ہے۔ وہ کبھی آرام نہیں کرتا۔ ہر روز وہ ایک نئی شان کے ساتھ ظہور کرتا ہے۔ سو اس روز خداوند تمام جہانوں کے خالق نے زمین کو دیکھا، وہ اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز حمد کے ترانے پڑھ رہی تھی۔ اس نے آسمان کو دیکھا، وہ بھی اپنے مالک کے حضور رکوع کی حالت میں جھکا اس کی تسبیح کر رہا تھا۔ اس نے پہاڑوں کو دیکھا، وہ بھی اپنی تمام تر بلندی کے ساتھ قیام کی حالت میں تکبیر مسلسل دے رہے تھے۔

خداوند خداے عظیم نے نظر کی اور دیکھا کہ جس ہستی کو اس نے خلیفہ بنایا تھا، وہ سرکش اور غافل ہو چکی ہے۔ زمین، آسمان اور پہاڑوں نے ڈر کر جس امانت کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا، انسان نے اس بوجھ کو اٹھا تو لیا، لیکن بھول گیا کہ وہ کس قدر سخت آزمایش میں ہے۔

خداوند خداے کریم نے نظر کی اور دیکھا کہ جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آگ کی ہر لپیٹ 'ھل من مزید' کی صدا بلند کر رہی ہے۔ وہ بھوکی تھی اور اس روز قیامت کی منتظر تھی جب اسے اس کی خوراک ''آدمی اور پتھر'' پیٹ بھر کر ملنی تھی۔

خداوند خداے رحیم نے نظر کی اور دیکھا کہ جنت کی حوریں اس کی ویرانی پر نوحہ خواں ہیں۔ فردوس کی بستی جسے اس نے اپنی تمام نعمتوں اور رحمتوں کا مرکز بنایا ہے، چیخ چیخ کر اس کے حضور فریاد کر رہی ہے کہ جس انسان کو تو نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، وہ اس جنت کی بربادی پر آمادہ ہے۔

خداوند خداے قدیر نے نظر کی اور اپنے بندے اسرافیل کو دیکھا۔ وہ صور لیے بیٹھا مالک کے حکم کا منتظر تھا۔ وہ بھی دوسرے آسمان والوں کی طرح اہل زمین کی حالت پر سخت افسردہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انسان کی آزمایش کی گھڑیاں اب ختم ہونے کو ہیں۔ زلزلۂ قیامت برپا ہونے کو ہے۔ اہل زمین پر بربادی کے سائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح وہ اہل زمین کے لیے استغفار کرنے کو مالک کی طرف متوجہ ہوا تو اسے خود کو دیکھتے پایا۔ وہ لرز اٹھا اور بے اختیار سجدہ میں گر گیا۔ پوچھا: آقا کیا سورج مغرب سے طلوع ہو گیا ہے؟

خداوند خداے بصیر نے نظر کی اور دیکھا کہ سورج مشرق سے طلوع ہو رہا ہے۔ لوگ روزے کی حالت میں اپنے کام کاج کی جگہوں پر روانہ ہو چکے ہیں۔ بچے اسکولوں میں کلاس لے رہے ہیں۔ عورتیں مردوں اور بچوں کو رخصت کرنے کے بعد سحری کی تھکان مٹانے نیند بھرنے کو لیٹی ہیں۔

خدواند خداے حکیم نے نظر کی اور عزرائیل کو دیکھا۔ وہ اپنے ان داتا کی نظر کا اشارہ سمجھ گیا۔ عزرائیل اور اس کے ساتھی فرشتے قطار در قطار مملکت خداداد کی ان وادیوں میں اترنے لگے جو زمین پر جنت کا نقشہ تھیں۔

کچھ دیر نہ گزری تھی کہ زمین پر قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔ پہاڑ لرزنے لگے۔ مکانات زمین بوس ہونے لگے۔ ہر طرف آہ و زاری اور شور و فغاں برپا ہو گیا۔ جن لوگوں کو کبھی بھولے سے خدا یاد نہ آیا تھا، وہ رب کی تکبیر بیان کرنے اور اس سے معافی مانگنے لگے۔ چند لمحوں میں زمین تھم گئی، مگر اس پر بربادی کے وہ آثار رقم ہو گئے کہ جس آنکھ نے دیکھا نم ہو گئی۔

جبرائیل اور میکائیل نے بارگاہ اقدس میں قدم بوسی کی اجازت چاہی۔ اذن ہوا۔ جن کی عظمت کا سکہ آسمانوں پر بیٹھا ہے، وہ خداوند خداے بزرگ کے حضور پیش ہوئے تو خوف سے لرز رہے تھے۔ دل میں سوال تھا، مگر لب پر لانے کی ہمت نہ تھی۔ آنکھوں میں تعجب تھا، مگر اس کے اظہار کی جرات نہ تھی۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سجدے میں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

گر گئے۔ دلوں کے حال جاننے والے نے کہا: اٹھو اور کہو کیا بات ہے۔ جبریل کی حیثیت بڑی تھی۔ بولے: آقا تیرا انسان... اس سے زیادہ ایک لفظ زبان سے نہ نکل سکا۔

جواب ملا: ہاں میرا انسان۔

میکائیل نے حوصلہ پا کر کہا: مالک بڑی بربادی ہوئی ہے۔

زمین و آسمان کے بادشاہ نے ایک شان بے نیازی سے دونوں کو دیکھا اور پوچھا: کیا بربادی ہوئی ہے؟

''تو پاک ہے'' کہہ کر دونوں خاموش ہو گئے۔ یہ کسی عام ہستی کی بارگاہ نہیں تھی، یہ عالم الغیب کا دربار تھا۔ وہ سب جاننے والے کو کیا بتاتے کہ کیا ہوا ہے۔

آسمان و زمین کے پالنے والے نے دونوں کا سکوت دیکھا تو پوچھا: لوگوں کا ایسا کیا نقصان ہوا ہے جو میں پورا نہیں کر سکتا؟

دونوں کی زبان سے جاری تسبیح، رب کی حمد میں بدل گئی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا مالک جب مصیبت کا بدلہ دیتا ہے، تو نہال کر دیتا ہے۔ وہ سینے کی ہر پھانس کھینچ کر نکال دیتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پھر ایک اشارہ ہوا۔ دونوں کی نگاہ کا پردہ اٹھ گیا۔

خداوند خداے رحمٰن نے نظر کی اور دیکھا کہ ایک اور خطۂ زمین جہاں سورج طلوع ہو رہا ہے، ایک ماں اپنے بچے کو نیند سے اٹھا رہی ہے۔ اسے جھنجھوڑ رہی ہے کہ وہ اٹھے اور اسکول جائے تاکہ اس کا مستقبل بہتر ہو سکے۔ وہ امتحان میں ناکام نہ ہو جائے۔ جب بچہ نہ اٹھا تو ماں نے تھپڑ مار کر اسے اٹھایا اور اس کے باپ نے روتے ہوئے بچے کو زبردستی اسکول چھوڑا۔ استاد سے کہا: میرے بچے کو دیر ہو گئی، لیکن زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے، اس لیے اسے کلاس میں بیٹھنے دیا جائے۔ استاد کو بھی رحم آیا، اس نے بچے کو اندر آنے دیا۔ بچہ اپنے دوستوں میں بیٹھا اور کچھ دیر میں ہنسی خوشی پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ خداوند تمام جہانوں کا خدا مسکرایا۔ اسے ماں باپ کی محبت کا یہ انداز اور استاد کی درگزر کی یہ ادا، دونوں پسند آئے۔ اس نے ہر مخلوق کو اپنے علم سے سکھایا ہے، سو یہ بھی اسی کا سکھایا ہوا سبق تھا۔

جبریل و میکائیل نے یہ منظر دیکھا اور دوبارہ سجدے میں گر گئے اور رب کی تسبیح بیان کرنے لگے۔

بارگاہ اقدس سے صدا آئی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم ہو گئی۔ قیامت سر پر کھڑی ہے۔ جنھیں یہ دنیا کو بتانا ہے، وہ بتا نہیں رہے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی دنیا کے فریب کو حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں۔ مجھے اپنی رحمت کی قسم میں ستر ماؤں سے بڑھ کر انسان کو چاہتا ہوں۔ یہ زلزلہ نہیں تھا۔ میں نے انسانیت کو جھنجھوڑا تھا۔ وہ اٹھیں اور قیامت کے

بعد کی ابدی زندگی کی تیاری کریں۔ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم جو قیامت کا سب سے بڑا نشان ہے، اگر اس کی امت نہیں بتائے گی تو میں خود دنیا کو بتاؤں گا کہ یہ دنیا پانے اور کھونے کی ابدی جگہ نہیں، آزمایش کی عارضی جگہ ہے۔

دنیا کی بربادی پر رونے والو، آخرت کی بربادی کے خوف سے روؤ۔ لوگوں کی بربادی پر رونے والو، اپنی بربادی کے غم میں آنسو بہاؤ۔ میرا عذاب ناقابل برداشت ہے۔ ابھی سورج مغرب سے طلوع نہیں ہوا۔ تمھارے پاس وقت ہے۔ واپس آجاؤ۔ مجھے سب سے بڑھ کر معاف کرنے والا پاؤ گے۔ دنیا کی محبت سے نکلو اور میرے پاس آؤ۔ جو میں دے سکتا ہوں، وہ کسی اور سے نہیں مل سکتا۔ جو جنت میں ہوگا، وہ دنیا میں کبھی نہیں مل سکتا۔ پانے اور کھونے، ہنسنے اور رونے کی جگہ دنیا نہیں آخرت ہے۔ یہ بات خود بھی جان لو اور دنیا کو بھی بتاؤ:

''اے انسانو، اپنے پروردگار سے ڈرو۔ بے شک، قیامت کا زلزلہ بہت ہی ہول ناک چیز ہے۔ جس روز تم اسے دیکھو گے، (حال یہ ہوگا کہ دہشت کے مارے) ہر دودھ پلاتی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ (خوف سے) اپنا حمل ڈال دے گی۔ تم دیکھو گے کہ لوگ (ایک دوسرے سے ایسے بے پروا ہو جائیں گے کہ گویا وہ) نشے میں ہیں۔ وہ ہرگز نشے میں نہیں ہوں گے، مگر اللہ کا عذاب بہت شدید ہوگا۔ (الحج ۲۲: ۱۔۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

زلزلہ محض اتفاقی حادثہ یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے انتباہ

زلزلے اور اس طرح کے دیگر حوادث کے دیکھنے کا ایک انداز تو یہ ہے کہ انسان اس خدا سے بے زار اور اس کا منکر ہو جائے جو اپنی مخلوق پر اتنی شدید تباہیاں بھیجتا ہے یا پھر اس کی صفات عدل و رحمت کی طرف سے شک و شبہے میں مبتلا ہو جائے۔ اس لیے کہ جو خدا بلا تفریق نیک و بد، اتنے بڑے پیمانے پر ہلاکت کا بازار گرم کر دے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد ایک حساس انسان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے خدا سے کوئی حسن ظن رکھ سکے (نعوذ باللہ)۔ مذکورہ معاملے کو ہم اگر اسلام کے علاوہ کسی بھی دوسرے مذہب کی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے، تو لامحالہ ہم درج بالا نتائج تک ہی پہنچیں گے۔ تاہم اسلام ہمیں خدا کی صفات کا ایک ایسا تصور دیتا ہے جو ہمیں ہر معاملے کو درست انداز سے دیکھنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ پیش نظر مضمون کا مقصد یہی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں زلزلے کے مظہر پر غور کیا جائے۔

قرآن کے مطابق اگرچہ خدا کا حقیقی تعارف یہی ہے کہ وہ ایک رحیم و کریم ہستی ہے، لیکن اس کی ذات کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ حکیم بھی ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ ہر حکیم بہت سے ایسے کام بھی کر جاتا ہے جو سرسری نگاہوں سے عبث، بلکہ نامناسب لگتے ہیں اور اپنے اندر کئی نقصان دہ پہلو لیے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ کام سرتاپا خیر ہی ہوتا ہے۔ اللہ جو سب سے بڑا حکیم ہے، جب اس کی کریم ذات کی طرف سے زلزلے جیسی ہول ناک مصیبت کا ظہور ہوتا ہے تو اسے خدا کی صفت حکمت کے تحت ہی دیکھنا چاہیے۔ اس پس منظر میں جب ہم غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ زلزلہ بھی دراصل اللہ کی اس رحمت کا ہی اظہار ہے جس کے تحت اس

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.org

نے اپنے رسولوں کو اس دنیا میں بھیجا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے بارے میں خدا کے تخلیقی منصوبے کو پیش نظر رکھا جائے۔ قرآن کے مطابق اللہ نے انسان کو اس دنیا میں عارضی طور پر آزمایش کے لیے پیدا کیا ہے۔ جب انسان کی موت آتی ہے تو وہ اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا، بلکہ دراصل وہ اس کی آزمایش کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس آزمایش کے دوران میں انسان کو فکروعمل کی مکمل آزادی دی گئی ہے اور اس دوران میں وہ مادی طور پر جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے، وہ اس کی کامیابی نہیں ہوتی اور جو کھوتا ہے وہ اس کی ناکامی نہیں ہوتی، بلکہ اس کی کامیابی یا ناکامی کا اصل فیصلہ قیامت کے روز ہوگا جب اللہ تمام انسانوں کو اپنے حضور جمع کرے گا۔ پھر جن لوگوں نے اچھے اعمال کیے ہوں گے، اللہ انھیں جنت کی ابدی کامیابی سے سرفراز کرے گا اور جنھوں نے برے کام کیے ہوں گے، انھیں سزا کے طور پر جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔

اللہ نے انسانوں کو اس آزمایش میں تنہا نہیں چھوڑا، بلکہ ان کی ہدایت کے لیے متعدد انتظامات کیے ہیں۔ اللہ نے ان کے وجدان میں اپنی توحید، آخرت کی جواب دہی اور خیر وشر کے بنیادی تصورات ودیعت کیے۔ انھیں فطرت سلیمہ پر پیدا کیا۔ انھیں عقل وفہم کی دولت عطا کی کہ وہ صحیح وغلط کی تمیز کر سکیں، ان کے اندر اور باہر اپنی نشانیاں پھیلا دیں اور سب سے بڑھ کر انبیا ورسل کو ہر دور میں انسانیت کی رہنمائی کے لیے بھیجا۔

مگر انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس عارضی دنیا کی رنگینیوں اور مسائل میں ایسا الجھتا ہے کہ قیامت کے آنے والے سنگین حادثے کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ فکرو وجدان کے اشارے نظر انداز کر دیتا ہے۔ عقل کو دنیاوی مصالح کے استعمال تک محدود کر دیتا ہے۔ رسولوں کی کھلی پکار سن کر بھی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہے۔ حتیٰ کہ انبیا کے ماننے والے بھی ان کی تعلیمات سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ جب بے حسی اتنی عام ہو جاتی ہے تو ایسے میں خداے حکیم دھرتی کو حکم دیتا ہے تو وہ اپنی آغوش میں سوئے ہوئے زلزلے اگل دیتی ہے۔ پھر یہ زلزلے ہی ہوتے ہیں جو انسان کو یاددہانی کراتے ہیں، اس بڑے زلزلے کی، جسے قیامت کے دن آنا ہے۔ وہ دن جب زمین پے در پے زلزلوں سے ہلا دی جائے گی یہاں تک کہ پہاڑ کوٹ کوٹ کر برابر کر دیے جائیں گے، وہ دن جو پوری انسانیت کی موت کا دن ہوگا۔

جس طرح زلزلہ اچانک آتا ہے، اسی طرح قیامت اچانک آئے گی، جس طرح زلزلہ مکمل تباہی کا پیغام ہے، اسی طرح قیامت مکمل تباہی کا نام ہے۔ جس طرح زلزلہ آنے پر زلزلے کے علاوہ ہر دوسرا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قیامت آنے پر ہر دوسرا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ جس طرح زلزلہ آنے پر انسان خوف وگھبراہٹ میں اپنی عزیز ترین متاع کو بھول جاتا ہے، اسی طرح قیامت آنے پر انسان ہر چیز بھول جائے گا حتیٰ کہ ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو بھی بھول جائے گی۔ جس طرح زلزلہ زمین کی رنگینیوں کو، وہ رنگینیاں جن میں مشغول ہو کر لوگ خدا اور آخرت کو بھول جاتے ہیں، تہ وبالا کر دیتا ہے، اسی طرح قیامت کے دن زمین اپنی ہر رنگینی سے محروم ایک ہموار میدان بنا دی جائے گی۔

زلزلہ اللہ کے ظلم کا نام نہیں، وہ اللہ کی بھیجی ہوئی آخری یاددہانی کا نام ہے۔ وہ لوگ جو دنیا کے زلزلے آنے پر بھی نصیحت حاصل نہ کریں، انھیں قیامت کے زلزلے کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ دن جب کسی کے لیے نصیحت حاصل کرنا کچھ بھی کارآمد نہ ہوگا۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۲۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ، لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ، وَجَنَّةٍ

ایمان والو، (آگے بھی خدا کی مدد چاہتے ہو تو) یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو[۱۹۹] اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ اور اُس آگ سے بچو جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور اللہ و رسول کے فرماں بردار رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے[۲۰۰]، اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف ایک

[۱۹۹] اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ممنوع صرف سود در سود ہے، بلکہ صورت حال کی تصویر اور اس کے نفرت انگیز ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۷۳ 'لا یسئلون الناس الحافاً' میں بھی یہی اسلوب ہے۔ استاذ امام اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"...اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے، 'الحافاً' کی قید اس کے ساتھ صرف سوال کرنے والوں کی عام حالت کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے لگائی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے کہ 'لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ'* (اپنی اولاد کو فقر کے اندیشے سے قتل نہ کرو)۔ اس میں ممانعت در حقیقت قتل کی ہے، 'خشیة املاق' کی

* بنی اسرائیل ۱۷: ۳۱

عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ، اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ، وَالۡكٰظِمِيۡنَ الۡغَيۡظَ، وَالۡعَافِيۡنَ عَنِ النَّاسِ، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً، اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ، ذَكَرُوا اللّٰهَ

دوسرے سے آگے بڑھو جس کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے، اُن پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو ہر حال میں خرچ کرتے ہیں[201]، خواہ تنگی ہو یا کشادگی، اور (جن پر خرچ کرتے ہیں، اُن کی طرف سے زیادتی بھی ہو تو) غصے کو دبا لیتے اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں[202] ـــــ (یہی خوب کار ہیں) اور اللہ اِن خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے ـــــ اور جن کا معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی بدکاری اِن سے ہو جاتی

قید محض اس کے گھنونے پن کو واضح تر کرنے کے لیے ہے۔ یا فرمایا ہے کہ 'لَا تَاۡكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً' (اور سود نہ کھاؤ دو گنا چوگنا کر کے)۔ اس میں ممانعت دراصل سود کھانے کی ہے۔ 'اضعافاً مضاعفة' کی قید محض اس کی کراہت کو نمایاں کرنے کے لیے ہے۔ یا فرمایا ہے: 'لَا تُكۡرِهُوۡا فَتَيٰتِكُمۡ عَلَى الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا'* (اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو، اگر وہ قید نکاح میں آنا چاہتی ہیں)۔ اس میں بھی مقصود مطلق اکراہ کی ممانعت ہے، 'ان اردن تحصناً' کی قید محض اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۲۴)

پھر یہاں چونکہ انفاق میں سبقت کی دعوت دی گئی ہے، اس لیے یہ واضح کرنا بھی پیش نظر ہے کہ مسابقت کا میدان اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی جنت ہے نہ کہ سود کی زیادہ سے زیادہ مقدار جس کو سمیٹنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے دنیا کے یہ طلب گار سر دھڑ کی بازی لگاتے ہیں۔

[۲۰۰] اس سے معلوم ہوا کہ اس تنبیہ کے بعد بھی جو لوگ سود کھانے پر مصر رہیں گے، وہ منکر ہیں اور ان کا انجام وہی ہو گا جو قرآن میں منکروں کے لیے بیان ہوا ہے۔

[۲۰۱] یعنی اس وسعت کے باوجود انسان اگر چاہے تو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اس جنت کو خرید سکتا ہے جس کی یہ تمثیل بھی کہ وہ زمین و آسمان جیسی ہے، بہرحال ایک تمثیل ہی ہے۔

[۲۰۲] یہ اس لیے فرمایا ہے کہ اکثر مال داروں کے پاس مال تو ہوتا ہے، لیکن اس کی نسبت سے ظرف نہیں ہوتا، لہٰذا وہ سائلوں کے غلط رویے پر ان کو جھڑک کر یا ان پر غصے کا اظہار کر کے اپنے انفاق سے ثواب کمانے کے بجائے

---

* النور ۲۴: ۳۳۔

فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ، وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ، وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا،
وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ، وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا، وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ﴿۱۳۶﴾

ہے یا اپنے حق میں کوئی برا کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں ــــــ اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخش دے ــــــ اور جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔[۲۰۳] یہی ہیں کہ جن کا صلہ اُن کے پروردگار کی مغفرت ہے اور وہ باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور کیا ہی اچھا صلہ ہے یہ نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔ **۱۳۰۔۱۳۶**

الٹا گناہ کما لیتے ہیں۔

[۲۰۳] یہ انفاق کے راستے کی ایک نہایت اہم مزاحمت کا بیان ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... جس طرح سود خوری کی علت روپے کی ایسی تونس پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی کے لیے کسی اچھے کام میں خرچ کرنا پہاڑ ہو جاتا ہے، اسی طرح بدکاری اور عیاشی کی چاٹ بھی کسی نیکی کے کام میں خرچ کرنے کی راہ بند کر دیتی ہے۔ جو لوگ اس راہ پر چل پڑتے ہیں، وہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں اس طرح بے بس ہو جاتے ہیں کہ ان کو کسی اور طرف نگاہ کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس وجہ سے قرآن نے انفاق کی تعلیم کے سلسلے میں جہاں سود خوری سے روکا ہے، وہیں بدکاری و بے حیائی اور اس کے لازمی نتیجہ اسراف و تبذیر سے بھی روکا ہے۔" (تدبر قرآن ۲/۱۷۹)

[باقی]

معز امجد

قریش کی حکمرانی سے متعلق روایات

(۱)

روی[۱] أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم قال: الناس تبع[۲] لقریش فی هذا الشأن. مسلمهم تبع لمسلمهم و کافرهم تبع لکافرهم[۳]. تجدون من خیر الناس أشد الناس کراهیة لهذا الشأن[٤] حتی یقع فیه[٥] و تجدون شر الناس ذا الوجهین الذی یأتی هؤلاء بوجه و یأتی هؤلاء بوجه[٦].

''روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ لوگ (حکمرانی کے) اس معاملے میں قریش کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے مسلمان قریش کے مسلمانوں کے پیروکار ہیں اور ان کے کافر قریش کے کافروں کے پیروکار تھے[۱]۔ تم سب سے اچھے آدمی کو دیکھو گے کہ (حکمرانی کا) یہ معاملہ اس کے ہاں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے یہاں تک کہ وہ اس میں ڈال دیا جائے[۲]، اور لوگوں میں سے سب سے برے آدمی تم منافقوں کو پاؤ گے جو بعض لوگوں میں ایک چہرہ لے کر آئیں اور بعض میں دوسرا[۳]۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

(۲)

روی[۷] أنـه صـلـی اللّٰه علیه و سلم قال: لا یزال هذا الأمر فی قریش ما بقی منهم اثنان[۸].

''روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک قریش کے دو آدمی بھی باقی ہیں[۴] (حکمرانی کا) یہ معاملہ انھی میں رہے گا[۵]۔''

(۳)

روی[۹] أن رسـول الـلّٰـه صـلـی اللّٰه علیه و سلم قال: الأمراء من قریش، الأمـراء من قریش، الأمراء من قریش[۱۰]. لـی علیهم حق ولهم علیکم حق[۱۱] ما فعلوا ثلاثا[۱۲]: مـا حـکموا فعدلوا و استرحموا فرحموا و عاهدوا فوفوا[۱۳]. فمن لم یفعل ذلك منهم فعلیه لعنة اللّٰه و الملائکة و الناس أجمعین.

''روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حکمران قریش میں سے ہوں گے، حکمران قریش میں سے ہوں گے، حکمران قریش میں سے ہوں گے[۶]۔ میرا ان پر حق ہے اور اسی طرح ان کا تمھارے اوپر حق ہے[۷] جب تک کہ وہ یہ تین کام کرتے رہیں: جب فیصلہ کریں تو عدل کریں، جب ان سے رحم طلب کیا جائے تو رحم کریں، اور جب کوئی عہد کریں تو اسے پورا کریں۔ ان میں سے جو ایسا نہیں کرے گا تو اس پر خدا، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو گی[۸]۔''

(۴)

روی[۱۴] أن رسـول الـلّٰـه صـلـی الـلّٰـه علیه و سلم قال: إن هذا الأمر فی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قـريـش، لا يـعـاديهـم أحد إلا كبه اللّٰه فى النار[15] عـلـى وجهه، ما أقاموا الدين.[16]

––––––––––

”روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (حکمرانی کا) یہ معاملہ قریش میں رہے گا۔ جب تک وہ دین پر قائم رہیں جو بھی اس معاملے میں ان کی مخالفت کرے گا، اللہ اسے مونھ کے بل جہنم کی آگ میں پھینک دے گا۔[9]“

(۵)

روى[17] أن رسـول الـلّٰـه صلى اللّٰه عليه و سلم قال: إن قريشا أهل صدق و أمانة فمن بغى لها العواثر[18] أكبه اللّٰه[19] فى النار لوجهه.[20]

––––––––––

”روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریش (کے لوگ) سچے اور امین ہیں۔ جو کوئی ان کی ہلاکت چاہے گا اللہ اسے منہ کے بل جہنم کی آگ میں پھینک دے گا۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ترجمے کے حواشی

۱۔ بنی اسماعیل کے تمام قبائل قریش کو مذہبی اور سیاسی معاملات میں اپنا نمائندہ اور رہنما تسلیم کرتے تھے۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصاً ان کی سیاسی حیثیت کا حوالہ دیا ہے۔

۲۔ آخرت میں آدمی نہ صرف یہ کہ اپنے ذاتی اعمال کے بارے میں جواب دہ ہوگا، بلکہ اجتماعیت سے متعلق اس کی جو ذمہ داریاں ہیں، ان کے بارے میں بھی اس سے پوچھا جائے گا۔ اجتماعیت سے متعلق ایک حکمران کی ذمہ داریوں کا بوجھ چونکہ عام آدمی کی نسبت زیادہ ہوتا ہے اس لیے خدا کے سامنے جواب دہی سے ڈرنے والا آدمی یہ کبھی پسند نہیں کرے گا کہ وہ حکمران بن کے اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ میں اضافہ کر لے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بہترین آدمی اقتدار میں آنا ناپسند کرتا ہے، تاہم اگر اسے یہ ذمہ داری سونپ دی جائے تو اللہ تعالیٰ اس منصب

کے تقاضے نبھانے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔

۳۔اس خاص سیاق میں یہاں سیاسی منافقت مراد ہے۔یعنی وہ لوگ جو حکمرانوں کے سامنے تو اپنی اطاعت و فرماں برداری ظاہر کرتے ہیں، مگر دوسروں کو اپنی مدد کا یقین دلا کر اس بات پر قائل کرتے ہیں کہ حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی جائے۔

۴۔قریش کو چونکہ بنی اسماعیل کے دوسرے قبائل کا سیاسی اعتماد حاصل تھا اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی اصول 'أمرهم شورىٰ بينهم' (ان کے آپس کے معاملات مشاورت پر مبنی ہیں) کے تحت لوگوں کو آگاہ کیا ہے کہ بنی اسماعیل کا اقتدار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قریش کو منتقل ہو جائے گا۔

۵۔یعنی جب تک قریش کو بنی اسماعیل کے دوسرے قبائل کا اعتماد حاصل ہے، ان کی حکمرانی کو ختم نہیں کیا جانا چاہیے، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو جائے، کیونکہ ایسا کرنے سے مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو نقصان پہنچے گا اور ان میں سیاسی انتشار پھیلے گا۔

۶۔ایک ہی بات کی یہ تکرار تاکید کے لیے ہے۔

۷۔یعنی جیسے میرا تمھارے اوپر یہ حق ہے کہ تم میرے وفادار رہو ایسے ہی ان کا یہ حق ہے کہ تم ان کے فرماں بردار رہو، کیونکہ انھیں یہ خصوصی منصب اللہ نے عطا کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۸۔یعنی خدا کی طرف سے شہادت علی الناس کے منصب پر فائز ہونے کے سبب بنی اسماعیل جب تک خدا کے عدل کے گواہ رہیں گے انھیں اپنے مخالفین پر طاقت اور غلبہ حاصل رہے گا اور جب وہ خدا کے ساتھ اپنے عہد کی خلاف ورزی کریں گے تو نہ صرف ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا، بلکہ سزا کے طور پر وہ دوسروں کے مغلوب کر دیے جائیں گے۔

۹۔یعنی جب تک انھیں بنی اسماعیل میں سے اکثریت کی حمایت حاصل رہے کوئی اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ان کی حکومت ختم نہ کرے۔

متن کے حواشی

پہلی روایت:

۱۔یہ روایت بخاری، رقم ۳۳۰۵ ہے۔بعض اختلافات کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۳۳۰۴۔ مسلم، رقم ۱۸۱۸، ۱۸۱۹، ۲۵۲۶۔ احمد بن حنبل، رقم ۱۸، ۷۰۹۰، ۷۳۰۴، ۷۵۴۷، ۸۲۲۶، ۹۱۲۱، ۹۴۰۲، ۹۵۹۱، ۱۰۸۰۱، ۱۴۵۸۵، ۱۵۰۹۱، ۱۵۰۹۲، ۱۵۱۵۱۔ ابن حبان، رقم ۶۲۶۳، ۶۲۶۴۔ بیہقی، رقم ۵۰۷۸، ۱۶۳۰۸، ۱۶۳۰۹۔ ابویعلیٰ، رقم ۱۸۹۴، ۲۲۷۲، ۶۲۶۴، ۶۴۳۹۔ حمیدی، رقم ۱۰۴۴۔ عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۹۴، ۱۹۸۹۵۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۸۲، ۳۲۳۸۴، ۳۲۳۸۷، ۳۲۳۹۳، ۳۲۳۹۴، ۳۲۴۰۰۔

۲۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۹۱۲۱ میں 'تبع' (پیروکار) کے بجائے 'أتباع' (پیروکار) کا لفظ روایت ہوا ہے، جبکہ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۸۱۹ میں 'الناس تبع لقریش فی هذا الشأن' (یہ لوگ اس معاملے میں قریش کے پیروکار ہیں) کے بجائے 'الناس تبع لقریش فی الخیر و الشر' (یہ لوگ اچھائی اور برائی میں قریش کے پیروکار ہیں) کے الفاظ، اور احمد بن حنبل، رقم ۱۵۰۹۲ میں 'الناس لقریش تبع فی الخیر و الشر' (یہ لوگ قریش ہی کے پیروکار ہیں اچھائی اور برائی میں) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۳۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۸۱۸ میں 'مسلمهم تبع لمسلمهم و کافرهم تبع لکافرهم' (ان کے مسلمان قریش کے مسلمانوں کے پیروکار ہیں اور ان کے کافر قریش کے کافروں کے پیروکار تھے) کے الفاظ 'تبع' (پیروکار) کے بغیر روایت ہوئے ہیں، جبکہ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۹۱۲۱ میں ان الفاظ کے بجائے 'کفارهم أتباع لکفارهم و مسلموهم أتباع لمسلمیهم' (ان کے کافر قریش کے کافروں کے پیروکار تھے اور ان کے مسلمان قریش کے مسلمانوں کے پیروکار ہیں) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۷۰۹۰ میں 'مسلمهم' (ان کے مسلمان) کے بجائے 'صالحهم' (ان کے نیکوکار) کے الفاظ، جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۷۵۴۷ میں 'خیارهم' (ان کے بہترین) کے الفاظ، ابن حبان، رقم ۶۲۶۴ میں 'مؤ منهم' (ان کے مومن) کے الفاظ اور ابن ابی شیبہ رقم ۳۲۴۰۰ میں 'برهم' (ان کے فرماں بردار) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۷۵۴۷ میں 'کافرهم' (ان کے کافر) کے بجائے 'شرارهم' (ان کے بدترین) کے الفاظ، جبکہ ابن حبان، رقم ۶۲۶۴ میں 'فاجرهم' (ان کے نافرمان) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۴۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۲۵۲۶ میں 'تجدو ن من خیر الناس أشد الناس کراهیة لهذا الشأن' (تم دیکھو گے کہ سب سے اچھا آدمی اسے سب سے زیادہ ناپسند کرے گا) کے بجائے 'تجدو ن من خیر الناس فی هذا الأمر أکرههم له' (تم اس معاملے میں سب سے بہتر آدمی اس کو پاؤ گے جو اسے سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں، جبکہ مسلم کی اسی روایت کے ایک متن میں 'تجدو ن من خیر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الناس فی ھذا الشأن أشدھم له کراھیۃ' (تم اس معاملے میں سب سے بہتر آدمی اس کو پاؤ گے جو اسے سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہو) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۵۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۲۵۲۶ میں 'حتی یقع فیہ' (یہاں تک کہ وہ اس میں جا پڑے) کے بجائے 'قبل أن یقع فیه' (اس سے پہلے کہ وہ اس میں جا پڑے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۶۔ 'وتجدون شر الناس ذا الوجھین الذی یأتی ھؤلاء بوجه ویأتی ھؤلاء بوجه' (اور لوگوں میں سے سب سے برے آدمی تم منافقوں کو پاؤ گے جو بعض لوگوں میں ایک منہ لے کر آئیں اور بعض میں دوسرا منہ لے کر) کے الفاظ بخاری، رقم ۳۳۰۴ میں روایت ہوئے ہیں، جبکہ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۲۵۲۶ میں 'یأتی' (آنا) دوبارہ روایت نہیں ہوا۔

ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۸۷ میں 'واللّٰه لو لا أن تبطر قریشا لأخبرتھا بما لخیارھا عند اللّٰه' (بخدا اگر قریش کے متکبر ہو جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو میں انھیں ان کی اس خوبی سے آگاہ کرتا جس کے سبب وہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں) کے الفاظ کا اضافہ روایت ہوا ہے۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۳۳۰۵ میں محسوس یہ ہوتا ہے کہ راوی نے ایک دوسری روایت 'والناس معادن: خیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الإسلام إذا فقھوا' (اور لوگ کانوں کی مانند ہیں: ان میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین تھے وہ اب دور اسلام میں بھی بہترین ہوں گے اگر وہ گہری سمجھ بوجھ حاصل کر لیں) کے الفاظ کو سہواً اس روایت سے ملا دیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۸ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قریش ولاۃ ھذا الأمر فبر الناس تبع لبرھم وفاجرھم تبع لفاجرھم.	''قریش اس معاملے کے نگران ہیں۔ (بنی اسماعیل کے) لوگوں میں سے نیک ان کے نیکوکاروں کے پیرو ہیں اور ان کے نافرمان ان کے نافرمانوں کے پیرو تھے۔''

دوسری روایت:

۷۔ یہ روایت بخاری، رقم ۳۳۱۰ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۶۷۲۱۔ مسلم، رقم ۱۸۲۰۔ احمد بن حنبل، رقم ۴۸۳۲، ۵۶۷۷، ۶۱۲۱۔ ابن حبان، رقم ۶۲۶۶، ۶۶۵۵۔

بیہقی، رقم ۱۶۳۱۰،۵۰۷۹۔ ابویعلیٰ، رقم ۵۵۸۹۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۹۱۔

۸۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۸۲۰ میں 'ما بقی منھم اثنان' (یہاں تک کہ ان کے صرف دو لوگ ہی باقی ہوں) کے بجائے 'ما بقی من الناس اثنان' (یہاں تک کہ اگر دو لوگ ہی باقی ہوں) کے الفاظ، جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۶۱۲۱ میں 'ما بقی فی الناس اثنان' (یہاں تک کہ لوگوں میں ان کے دو ہی باقی ہوں) کے الفاظ اور بیہقی، رقم ۱۶۳۱۰ میں 'ما کان فی الناس اثنین' (جب تک لوگوں میں ان کے دو بھی باقی ہوں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

تیسری روایت:

۹۔ یہ روایت احمد بن حنبل، رقم ۱۹۸۱۸ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

احمد بن حنبل، رقم ۷۶۴۰، ۱۲۳۲۹، ۱۲۹۲۳، ۱۷۸۴۱، ۱۹۵۵۹، ۱۹۷۹۲، ۱۹۷۹۷۔ ترمذی، رقم ۲۲۲۷۔ ابن حبان، رقم ۴۵۸۱، ۴۵۸۴۔ بیہقی، رقم ۵۰۸۱، ۱۶۳۱۷، ۱۶۳۱۸، ۱۶۳۱۹، ۱۶۳۲۰، ۱۶۳۲۱، ۱۶۳۲۲، ۱۶۳۲۳۔ ابویعلیٰ، رقم ۵۶۴، ۳۶۴۴، ۳۶۴۵، ۴۰۳۲، ۴۰۳۳۔ سنن الکبریٰ، رقم ۵۹۴۲۔ عبدالرزاق، رقم ۱۹۹۰۲۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۸۸، ۳۲۳۸۹، ۳۲۳۹۰، ۳۲۳۹۷، ۳۷۷۱۹۔

۱۰۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۹۵۵۹ میں 'الأمراء من قریش' (حکمران قریش میں سے ہوں گے) کی تکرار کے بجائے 'إن ھذا الأمر فی قریش' (یہ معاملہ قریش میں رہے گا) کے الفاظ، جبکہ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۹۷۹۲ میں 'الأئمة من قریش' (حکمران قریش میں سے ہوں گے) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۱۱۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۷۶۴۰ میں 'لی علیھم حق ولھم علیکم حق' (میرا ان پر حق ہے اور ان کا تمھارے اوپر حق ہے) کے بجائے 'إن لی علی قریش حقا وإن لقریش علیکم حقا' (میرا قریش پر حق ہے اور قریش کا تمھارے اوپر حق ہے) کے الفاظ، بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۲۳۲۹ میں 'إن لھم علیکم حقا ولکم علیھم حقا مثل ذلك' (ان کا تمھارے اوپر حق ہے اور اسی طرح تمھارا ان پر حق ہے) کے الفاظ، بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۶۳۱۸ میں 'ولی علیکم حق عظیم ولھم' (میرا تمھارے اوپر ایک بڑا حق ہے اور اسی طرح ان کا بھی) کے الفاظ، بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۶۳۲۱ میں 'ولی علیکم حق ولھم علیکم حق' (میرا تم پر حق ہے اور ان کا بھی تمھارے اوپر حق ہے) کے الفاظ، بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۶۳۲۲ میں 'ولی علیھم حق ولکم علیھم حق' (میرا ان پر حق ہے اور تمھارا بھی ان پر حق ہے) کے الفاظ،

جبکہ بعض روایات مثلاً ابویعلیٰ، رقم ۴۰۳۳ میں 'لی علیکم حق و لهم علیکم مثل ذلك' (میرا تم پر حق ہے اور اسی طرح ان کا تمھارے اوپر حق ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۱۲۔ بعض روایات مثلاً ابویعلیٰ، رقم ۵۶۴ میں 'ما فعلوا ثلاثا' (جب تک وہ تین کام کرتے رہیں) کے بجائے 'ما أقاموا بثلاث' (جب تک وہ تین چیزوں پر عمل پیرا رہیں) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۱۳۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۶۴۰ء میں 'و عاهدوا فوفوا' (جب وہ عہد کریں تو اسے پورا کریں) کے بجائے 'و ائتمنوا فأدوا' (جب انھیں امانت سونپی جائے تو اسے لوٹائیں) کے الفاظ، جبکہ بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۶۳۲۲ میں 'و أقسطوا إذا أقسموا' (جب وہ تقسیم کریں تو انصاف کریں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۹۵۵۹ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إن هذا الأمر فی قریش ما داموا. إذا استرحموا رحموا و إذا حکموا عدلوا و إذا قسموا أقسطوا فمن لم یفعل ذلك منهم فعلیه لعنة الله و الملائکة و الناس أجمعین، لا یقبل منه صرف و لا عدل.

''جب تک قریش موجود ہیں (حکمرانی کا) یہ معاملہ انھی میں رہے گا۔ جب ان سے رحم طلب کیا جاتا ہے تو وہ رحم کرتے ہیں، جب وہ فیصلہ کرتے ہیں تو عدل کرتے ہیں اور جب وہ تقسیم کرتے ہیں تو انصاف سے کام لیتے ہیں۔ ان میں سے جو ایسا نہ کرے گا تو اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی، اس سے نہ کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ کوئی فدیہ۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۹۷۹۲ میں 'و إذا قسموا أقسطوا' (جب وہ تقسیم کریں تو انصاف کریں) کے بجائے 'و إذا عاهدوا و فوا' (جب وہ عہد کریں تو اسے پورا کریں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ترمذی، رقم ۲۲۲۷ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قریش و لاة الناس فی الخیر و الشر إلی یوم القیامة.

''خیر ہو یا شر، قریش قیامت تک ان لوگوں کے نگران ہیں۔''

معلوم یہی ہوتا ہے کہ راوی نے اس روایت کو پہلی روایت کے مضمون سے ملا دیا ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مدعا بالکل تبدیل ہو کے رہ گیا ہے۔ مزید برآں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس روایت میں 'إلی یوم القیامة'

(قیامت کے دن تک) کے الفاظ کا اضافہ راوی سے سہواً ہو گیا ہے۔

چوتھی روایت:

۱۴۔ یہ روایت بخاری، رقم ۶۷۲۰ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۳۳۰۹۔ احمد بن حنبل، رقم ۱۶۸۹۸۔ بیہقی، رقم ۱۶۳۱۱۔ سنن الکبریٰ، رقم ۸۷۵۰۔ دارمی، رقم ۲۵۲۱۔

۱۵۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۳۳۰۹ میں 'فی النار' (آگ میں) کے الفاظ روایت نہیں ہوئے۔

۱۶۔ عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۹۷ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ قریش کے حق میں ایک دعا مانگتے ہوئے ارشاد فرمائے۔

پانچویں روایت:

۱۷۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۸۳ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

احمد بن حنبل، رقم ۱۹۰۱۵۔ عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۹۷، ۱۹۹۰۵۔

۱۸۔ عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۹۷ میں 'فمن بغى لها العواثر' (جو کوئی ان کی ہلاکت چاہے گا) کے بجائے 'فمن أرادها أو بغاها العواثر' (جو کوئی ان کی ہلاکت چاہے گا یا اس کی کوشش کرے گا) کے الفاظ، جبکہ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۸۳ میں 'فمن بغى لهم العواثر' (جو ان کی ہلاکت چاہے گا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۱۹۔ عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۹۷ میں 'أكبه الله' (اللہ اسے الٹا گرا دے گا) کے بجائے ان کے ہم معنی الفاظ 'كبه الله' نقل ہوئے ہیں۔

۲۰۔ عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۹۷ میں 'لوجهه' (اس کے منہ پر) کے بجائے 'لمنخره' (اس کے نتھنوں پر) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

عبدالرزاق، رقم ۱۹۹۰۵ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من يهن قريشا يهنه الله. "جو قریش کی توہین کرے، اللہ اس کی توہین کرے گا۔"

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

حضرت مسیح کا مقام

(مسلم، رقم ۲۸)

حدثنا عبادة بن الصامت قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: من قال أشهد أن لا إله إلا اللّٰه وحده لا شريك له وأن محمدا عبده ورسوله وأن عيسى عبد اللّٰه وبن أمته وكلمته ألقاها إلى مريم وروح منه وأن الجنة حق وأن النار حق وأدخله اللّٰه من أى أبواب الجنة الثمانية شاء.

''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کہا: میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور یہ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے بندے ہیں اور اس کی لونڈی کے بیٹے ہیں، وہ اس کا کلمہ ہیں جس نے اسے مریم کو القا کیا تھا، اور اس کی روح ہیں، اور یہ کہ جنت حق ہے اور یہ کہ جہنم حق ہے، اللہ تعالیٰ اسے جنت کے آٹھ دروازوں میں سے جس دروازے سے وہ چاہے گا داخل کریں گے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

ألـقـاهـا: 'ألـقی' کالفظی مطلب 'ڈالنا' ہے۔اسی سے یہ دل میں بات ڈالنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ کلمہ کی مناسبت سے آیا ہے۔مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کے پیدا ہونے کا حکم صادر فرما دیا اور یہ حکم اپنی تعمیل کے لیے حضرت مریم علیہا السلام کی طرف بھیج دیا گیا۔

معنی

یہ روایت اس کے مضمون ہی سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسیحی حضرات کے ساتھ گفتگو کا حصہ ہے۔آپ نے اس گفتگو میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ خود آپ کی ذات کے بارے میں اور حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں درست عقیدہ کیا ہے۔اس روایت کا پہلا حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔حضرت مسیح علیہ السلام کو الوہیت حاصل نہیں تھی۔ بلکہ وہ خدا کی مخلوق اور اس کے بندے تھے۔اس روایت میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ قرآن مجید میں بھی بیان ہوا ہے۔سورۂ نساء میں ہے:

یٰٓاَ ھْلَ الْکِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ...(۴:۱۷۱)	''اے اہل کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی بات نہ ڈالو۔مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القا کیا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ چنانچہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ...۔''

کلمہ اور روح سے کیا مراد ہے، شارحین نے ان کے حضرت مسیح پر اطلاق کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں۔ہم یہاں ان کو نکات کی شکل میں بیان کرتے ہیں:

۱۔کلمہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حجت تھے۔بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔وقت سے پہلے باتیں کیں۔مردے زندہ کیے۔

۲۔ چونکہ آپ کی پیدایش کلمۂ کن سے براہ راست ہوئی ہے، اس لیے آپ کو کلمہ کہا گیا ہے۔

۳۔ چونکہ آپ کا کلام لوگوں کے لیے نافع ہوا، اس لیے آپ کو کلمۃ اللہ کہا گیا۔جیسا کہ حضرت خالد بن ولید کو

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سیف اللہ کہا گیا ہے۔

۴۔آپ نے بچپن ہی میں اپنے بارے میں کہا:'انی عبد اللّٰہ'۔اسی کی مناسبت سے آپ کوکلمہ کہا گیا۔

۵۔محض اللہ کے ارادے سے پیدا ہوئے،اس لیے روح کہا گیا۔

۶۔چونکہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے،اس مناسبت سے روح کہا گیا ہے۔

۷۔کسی مادی ذریعے کے بغیر جسدو روح پائی،اس لیے روح قرار دیے گئے۔

مولانا امین احسن اصلاحی محولہ بالا آیت کے ضمن میں کلمہ اور روح کہنے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''(حضرت مسیح) کی ولادت اللہ کے کلمہ 'کن' سے ہوئی جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم کی طرف القا فرمایا اور ان کو روح بھی خدا کی جانب سے عطا ہوئی۔مطلب یہ ہے کہ ان کی خارق عادت ولادت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر ان کو خدائی کا درجہ دے دیا جائے۔ان کی ولادت اسی طرح خدا کے کلمہ 'کن' سے ہوئی ہے جس طرح آدم کی ولادت کلمہ 'کن' سے ہوئی ہے اور ان کے اندر بھی خدا نے اسی طرح روح پھونکی ہے جس طرح آدم کے اندر روح پھونکی۔اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں،وجود اور زندگی تو جس کو بھی ملتی ہے،خدا ہی کے حکم اور اسی کی عطا کردہ روح سے ملتی ہے۔''(تدبر قرآن ۲/۴۳۶)

اس سے واضح ہے کہ مولانا کے نزدیک کلمہ اور روح حضرت مسیح کے اختصاص کو بیان نہیں کرتے،بلکہ ان کے خدا کی مخلوق ہونے کو واضح کرتے ہیں۔ہمارے نزدیک قرآن کا مدعا یہی ہے اور اس کی روشنی میں ان الفاظ کا یہی پہلو درست محسوس ہوتا ہے۔حضرت مسیح کی خارق عادت پیدایش کے لیے یہ تعبیرات ان کے مخلوق ہونے کی نفی نہیں کرتیں اور نہ ان سے یہ مطلب لینا چاہیے۔

اس روایت کے آخر میں اس ایمان کا ثمرہ بیان ہوا ہے۔ہم قرآن کی روشنی میں یہ بات پچھلی روایات کی شرح میں بیان کر چکے ہیں کہ درست ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح بھی ضروری ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرح کے بیانات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ یہ محض ایمان پر نجات کو موقوف کر رہے ہیں۔خدا کے صالح بندے ہی خدا کے انعامات کے مستحق ہوں گے۔'علی ما کان من العمل' کا ٹکڑا حدیث ابوذر کے 'إن زنی و ان سرق' کے محل میں ہے۔قرآن مجید میں بتا دیا گیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنے عقیدہ وعمل کی اصلاح کر لیتا ہے،وہ اللہ کی مغفرت کا حق دار بن جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متون

امام مسلم کی یہ روایت ایک آدھ چیز کو چھوڑ کر ان تمام اجزا کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جو اس روایت کے مختلف متون میں نقل ہوئے ہیں۔ مثلاً اس روایت میں 'عبدہ' کے بعد 'رسولہ' نہیں ہے، لیکن بعض متون میں اس جملے میں حضرت مسیح کا رسول ہونا بھی بیان ہوا ہے۔ یہ اضافہ بھی یہود کی نسبت سے ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہود حضرت مسیح کی رسالت کے قائل نہیں تھے۔ اسی طرح ایک روایت میں جہاں 'النار حق' اور 'الجنة حق' کے الفاظ آئے ہیں وہاں 'البعث حق' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اضافہ جنت اور جہنم کے ساتھ ایک مناسبت تو رکھتا ہے، لیکن اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ نہ کہا ہو۔ اس خیال کو یہ بات موکد کر دیتی ہے کہ اس روایت کے زیادہ متون اس جملے کے بغیر ہیں۔ زیر نظر روایت میں آخری جملہ 'علی ما کان من العمل' کی توضیح سے خالی ہے۔ جبکہ خود امام مسلم رحمہ اللہ نے اس سے اگلی روایت میں اور بعض دوسرے محدثین نے اس جملے کو روایت کیا ہے۔

ان کے علاوہ اس روایت کے متون میں کچھ چھوٹے چھوٹے لفظی فرق بھی ہیں۔ مثلاً زیادہ تر روایات میں 'من قال أشهد ...' کے بجائے 'من شهد' روایت ہوا ہے۔ اسی طرح 'أن الجنة حق' والا جملہ بعض روایات میں 'ان' کے بغیر روایت ہوا ہے۔ علاوہ ازیں بعض روایات میں 'ابن أمته' کے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ جن روایات میں یہ الفاظ نہیں ہیں، ان میں کسی راوی سے سہو ہوا ہے۔ اس لیے کہ یہ متن کے مقصود سے گہری مناسبت رکھتے ہیں۔ جس طرح حضرت مسیح کے بارے میں الوہیت کا عقیدہ رائج ہے، بعینہٖ حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں بھی اسی طرح کے مزعومات رائج تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں یہ بیان کہ وہ خدا تعالیٰ کی بندی تھیں، موقع کلام کا واضح تقاضا ہے۔

کتابیات

بخاری، رقم ۳۲۵۲۔ احمد، رقم ۲۲۷۲۷۔ ابن حبان، رقم ۲۰۷۔ مسند الشامیین، رقم ۵۵۵۔ سنن کبریٰ، رقم ۱۰۹۶۹، ۱۰۹۷۰، ۱۱۱۳۲۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ساجد حمید

دین آسان ہے

عن ابی ھریرة عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم، قال: ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ. فسددوا، وقاربوا، وابشروا. واستعینوا بالغدوة والروحة وشیء من الدلجة.

(بخاری، کتاب الایمان)

''ابوہریرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین آسان ہے، لیکن جو اس میں سختی برتے گا، دین اسے پچھاڑ دے گا۔ اس لیے تمھیں چاہیے کہ سیدھی راہ پر چلو، میانہ روی اختیار کرو۔ لوگوں کو انعام کی نوید بھی دو اور صبح و شام اور رات کے خوش گوار وقتوں میں اللہ کی بندگی بجالایا کرو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مشکلات کا حل

یشاد الدین: دین میں سختی برتنا۔ یعنی اس پر عمل کرتے ہوئے اپنی طاقت سے تجاوز کر جانا۔

سددوا: اس سے مراد راہ راست کو اختیار کرنا ہے۔ سیدھی راہ سے مراد، ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔

قاربوا: افراط و تفریط سے بچ کر میانہ روی اختیار کرو۔

واستعینوا بالغدوة والروحة وشیء من الدلجة مراد یہ ہے کہ ان خوش گوار وقتوں سے اللہ کے ہاں قرب حاصل کرنے کے لیے مدد لو۔ 'غدوة': سحری سے لے کر دن نکلنے تک کے وقت کو کہتے ہیں۔ 'روحة': دن میں زوال کے بعد سے رات کے پوری طرح چھا جانے تک کے وقت کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور 'دلجة' رات کے آخری

وقت کو کہتے ہیں۔ یہی اوقات ہماری نمازوں کو محیط ہیں، ہماری نمازوں کے اوقات ایک اہمیت کے حامل ہیں۔ ان اوقات میں ہماری زمین کی کائنات نمایاں تبدیلیوں سے گزرتی ہے۔

وضاحت حدیث

ان الدین یسرٌ: دین آسان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ یہ دین اپنے سب تقاضوں کے ساتھ مشکل نہیں ہے کیونکہ اس کے تمام تقاضے ہماری فطرت کے مطابق ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ یہ دین انسان کی طاقت سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں دیتا۔

یہ دین ہماری فطرت کے مطابق ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب ایک سلیم الفطرت آدمی اپنے اردگرد کی چیزوں کو دیکھتا ہے تو ان نعمتوں سے اس کو ایک خالق عظیم کے کائنات کے پس پردہ موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے اوپر اس خالق کے گوناگوں احسانات پاتا ہے تو اس کا دل احسان مندی کے گراں قدر جذبے سے جھک جاتا ہے، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھک جانے کا یہ طریقہ جو اس نے اختیار کیا ہے، صحیح بھی ہے یا نہیں؟ اگر یہ صحیح نہیں تو پھر صحیح طریقہ کیا ہے؟ یہ سوال انسان کو صحیح طریقے کی تلاش میں سرگرداں کر دیتا ہے۔ انسان کے دل میں پیدا ہونے والے اس سوال کا جواب خالق کائنات کی طرف سے دین اسلام ہے۔

یہ دین اتنا ہی آسان ہے جتنا پیاس لگنے پر پانی پی لینا۔ اپنی پیاس بجھانے کے لیے بھی ہمیں کچھ کرنا پڑتا ہے اور روح کی پیاس بجھانے کے لیے بھی ہمیں کچھ اعمال سرانجام دینا پڑتے ہیں۔ ان اعمال کا نام دین ہے۔

ہمارے وجود کے جتنے تقاضے ہیں؛ مثلاً کھانا، پینا، سونا، اور بسنا وغیرہ۔ ان سب تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہم ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں، مصیبتیں جھیلتے ہیں اور نہ جانے کتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ یہ سب کام خواہ کتنے ہی مشکل ہوں ہمارے لیے آسان ہوتے ہیں، اور بعض اوقات ان کو سرانجام دینے کے لیے ہم جان پر کھیل جاتے ہیں۔

ہمارے وجود کا ایک تقاضا پروردگار کا شکر ادا کرنا بھی ہے۔ اس تقاضے کو پورا کرنا بھی آدمی کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بھی وہ ہر طرح کی مصیبت مول لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو اس تقاضے کا اسی طرح احساس ہو جائے جیسے پیاسے کو اپنی پیاس کا احساس ہوا جاتا ہے۔ اور بھوکے کو اپنی بھوک کا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پھر یہ بھی کہ یہ دین خود خالق کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ خالق اپنی مخلوق کی فطرت سے جس قدر واقف ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی واقف نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ حقیقت ہے کہ اس کا دیا ہوا دین مخلوق کی فطرت کے مطابق ہوگا۔ جس طرح ایک انجینئر ایک مشین بناتا ہے۔ تو وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس سے کیا کام لیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح ہم انسانوں کو بنانے والے نے ہماری مشینری کے بارے میں بتا دیا ہے کہ اس نے آدمی کو اسی دین پر چلنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ یعنی انسان کی تخلیق ہی اس دین پر چلنے کے لیے ہوئی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (الذاریات ۵۱:۵۶)

''ہم نے جن و انس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہمارے عبادت گزار بن کر رہیں۔''

گویا ایک مشین روئی بیلنے کی بنائی گئی۔ تو روئی بیلنا اس مشین کی فطرت ہے۔ مشین کی اس فطرت کے مطابق اس سے کام لینا آسان ہے۔ لیکن روئی بیلنے کے بجائے اگر ہم اس سے گندم پیسنے کا کام لینا شروع کر دیں تو شاید دلیا بھی ہمارے ہاتھ نہ آئے۔ بالکل اسی طرح ہمارے خالق نے اگر ہمیں اس لیے بنایا ہے کہ ہم اس کی بندگی کرتے ہوئے جئیں تو پھر یہ بات بالکل واضح ہے کہ روئی بیلنے کی مشین کی طرح ہماری فطرت کے مطابق جو کام ہے وہ دین پر چلنا ہے۔ تو جس طرح روئی بیلنے کی اس مشین کے لیے روئی بیلنا آسان ہے، اسی طرح ہمارا اس دین پر چلنا آسان ہے۔

لیکن، بہر حال یہ ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اس کو ہر آدمی پوری طرح سے نہیں اٹھا سکتا۔ اس چیز کا لازمی تقاضا ہے کہ ہر آدمی پر اس کی طاقت اور صلاحیت کے مطابق ذمہ داریاں ہوں اس لیے قرآن نے ایک اصول وضع فرما دیا کہ

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً إِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ ۲:۲۸۶)

''اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔''

ہر شخص بس اسی حد تک مکلّف ہے جس حد تک اسے طاقت عطا ہوتی ہے۔ جو چیز اس کے حدود و اختیار اور امکان سے باہر ہے۔ اس کے بارے میں اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ ان کمزوریوں کی صورت میں، اللہ نے بندوں کو رخصتیں دی ہیں۔ یعنی روئی بیلنے کی چھوٹی مشین سے بڑی مشین جتنے کام کا تقاضا نہیں ہوگا۔

اوپر کی بحث سے یہ معلوم ہوا کہ پورے کا پورا دین ہماری بشری کمزوریوں، قوتوں اور صلاحیتوں کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ اور چونکہ تمام لوگ ایک طرح کی صلاحیتیں نہیں رکھتے اس لیے ان کی سہولت کے لیے رخصتیں ہیں تاکہ دین آسان رہے۔ اب ہم حدیث کے دوسرے جملے کو لیتے ہیں۔

ولن یشاد الدین احدٌ الا غلبه:

اس سے مراد یہ ہے کہ دین آسان ہے، لیکن جس نے اس کو مشکل بنایا اور اس کو سر لینے کی کوشش کی اس کا انجام یہ ہوگا کہ دین اس کو شکست دے دے گا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ

عن عبد اللّٰہ بن عمر، قال: قال لی، نبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: الم اخبر، انک تقوم اللیل وتصوم النہار. قلت انی افعل ذلک، قال: فانک اذا فعلت ذلک ہجمت عینک ونفہت نفسک. وان لنفسک حق ولاہلک حق. فصم وافطر وقم ونم. (بخاری، کتاب التہجد)

''عبداللہ بن عمر کہتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سمجھتے ہو کہ مجھے خبر نہیں ہوتی حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تم رات بھر قیام کرتے ہو اور دن میں روزہ رکھتے ہو۔ تو عبداللہ بن عمر نے کہا: ہاں میں ایسا کرتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا: تم ایسا کرتے ہو تو یاد رکھو کہ تمھاری آنکھیں اندر دھنس جائیں گی جسم کمزور ہو جائے گا جبکہ تمھیں خیال رکھنا چاہیے کہ تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔ اور تمھارے گھر والوں کا بھی۔ اس لیے روزے رکھو تو وقفہ بھی کرو۔ رات میں قیام کرو تو سویا بھی کرو۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جسم کے حقوق ادا نہ کرنے سے جو نتیجہ نکلے گا اس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے کہ آنکھیں اندر دھنس جائیں گی اور جسم کمزور پڑ جائے گا۔ اس کمزوری اور لاغری سے، وہ آدمی جو قیام وصیام میں صبح و شام مشغول رہتا تھا، ہوسکتا ہے کہ پھر رمضان کے روزے رکھنے کے بھی قابل نہ رہے۔ اور وہ جو رات بھر قیام کیا کرتا تھا ہوسکتا ہے کہ پھر فرض نمازوں کا ادا کرنا بھی اس کے لیے مشکل ٹھیرے۔ جو آدمی اس طریقے کو اختیار کرتا ہے، اس کا حال اس شخص کا سا ہے، جس نے سونے کے انڈے حاصل کرنے کے لیے مرغی ذبح کر دی ہو، اور پھر مرغی سے بھی محروم ہو گیا ہو۔ ایسے اعمال دنیا والوں کی نظر میں بھی احمقانہ ہوتے ہیں اور خدا کے ہاں بھی کچھ زیادہ اجر نہیں رکھتے۔ کیونکہ ایسا کرنے والوں کا اپنے عمل پر دوام بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی دل کی حضوری ہوتی ہے، جبکہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہوتا ہے۔ جس پر آدمی کا ہمیشہ عمل رہے۔ خواہ یہ عمل کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ

ای العمل احب الی اللّٰہ قال: ادومہ وان قل. (بخاری، کتاب الایمان)

''کون سا عمل اللہ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ کام جو ہمیشہ عمل میں رہے۔''

خواہ وہ عمل کتنا ہی حقیر ہو۔''

اعمال میں شدت ویسے بھی آدمی کو بے زار کر دیتی ہے۔اس بے زاری میں خود عمل کرنے والا بھی دل میں تنگی محسوس کرتا ہے جس سے ان نیکیوں کے اکارت چلے جانے کا احتمال ہوتا ہے جن کو اس نے بڑی محنت سے کیا ہوتا ہے۔اور دوسروں کے حقوق بھی غصب ہوتے ہیں۔اللہ کے ہاں یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ ایک حق کو پورا کرنے میں آدمی اس قدر لگ جائے کہ اس کے دوسرے بیسیوں حقوق ادا ہونے سے رہ جائیں۔اللہ کے ہاں تو یہ بات پسندیدہ ہے کہ ایک وقت میں بندے پر جتنے حقوق ہیں وہ سب کے سب پورے ہوں اور ہمیشہ پورے ہوتے رہیں۔ یہ نہیں کہ ماں باپ تو گھر میں اس کی مدد کو ترستے رہیں اور وہ مسجد کے کسی کونے میں اپنے تئیں نیکیاں کما رہا ہو۔ یہ دین نہیں بے دینی ہے۔آدمی پر اس کے گھر کے، اس کی ریاست کے، اس کے ہم سایوں کے اور خود اس کے اپنے نفس کے حقوق ہیں جن کو پوری ذمہ داری سے ادا کرنا چاہیے اور ان کے ساتھ ساتھ اللہ کے حقوق بھی پوری طرح ادا ہونے چاہییں۔

فسددوا وقاربوا وابشروا:

ان تمام حقوق کو جو ریاست، معاشرے اور گھر کی طرف سے فرد پر عائد ہوتے ہیں پوری طرح سے ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جائے اور افراط وتفریط سے بچ کر میانہ روی اختیار کی جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ عمل کیا جائے جو آدمی کی طاقت میں ہو اور جس پر وہ آسانی کے ساتھ ہمیشہ عمل کر سکے۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ کوئی حکم لوگوں کی استطاعت سے بڑھ کر نہ ہو۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، اذا امرھم، امرھم من الاعمال بما یطیقون قالوا: انا لسنا کھیئتك یا رسول اللّٰہ. ان اللّٰہ قد غفر لك ما تقدم ذنبك وما تاخر. فیغضب، حتی یعرف الغضب فی وجھہ. ثم یقول: ان اتقاکم واعلمکم باللّٰہ انا.
(بخاری، کتاب الایمان)

''جب آپ لوگوں کو کوئی حکم دیتے تو اس بات کا حکم دیتے جس کی لوگ استطاعت رکھتے ہوں۔ ایک مرتبہ لوگوں نے آپ سے کہا (ہمیں کچھ اور بھی بتائیے) کیوں کہ ہمارا معاملہ آپ سا نہیں ہے آپ کی تو تمام اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی گئیں ہیں۔ (ہمیں تو زیادہ عمل کرنے کی ضرورت ہے) اس پر آپ کو غصہ آ گیا۔ غصہ اتنا آیا کہ آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پھر کہا: (تم مجھ سے زیادہ متقی بنتے

ہو؟) میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اس کو جانتا ہوں (مجھ سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو میری پیروی کرو)۔''

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کسی انسان کی تقویٰ اور نیکی میں آخری حد ہے۔اس سے آگے جو کچھ ہے وہ بے دینی ہے۔آپ کا ارشاد ہے۔

واللّٰہ انی لاخشاکم للّٰہ واتقاکم لہ. ولکنی اصوم وافطر. واصلی وارقد اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی، فلیس منی. (بخاری، کتاب النکاح)

''خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں، اور میں سب سے زیادہ اس کے غضب سے بچنا چاہتا ہوں۔لیکن میں (عام دنوں میں) روزے بھی رکھتا ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں۔ میں رات میں قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میرا طریقہ ہے) جس نے اس طریقے کو چھوڑا وہ میرا امتی نہیں ہے۔''

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'فسددوا' محکم راستہ اختیار کرو۔ یہ محکم راستہ ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہی ہے۔اور 'قاربوا' سے اس پر مزید تاکید فرمائی کہ میرے طریقے کے قریب آؤ۔ نہ اس میں اضافہ کرو اور نہ اس میں کمی کرو۔

ابشروا: بھی ایک ایسا حکم ہے جیسا 'فسددوا' اور 'قاربوا' ہیں۔اس میں دین کی طرف دعوت دینے والوں کے لیے حکم ہے کہ وہ لوگوں کو صرف دوزخ سے ڈرائیں ہی نہیں، بلکہ ان کو جنت اور اس کی نعمتوں کی بشارت بھی دیں۔ یہ نہ ہو کہ لوگ دین کو ڈرانے والے کی چیخیں سمجھ کر اس سے بھاگ جائیں۔ بلکہ انعام پانے کی نوید سن کر دین کی طرف لپکیں۔ کیونکہ انعام پانے کی خواہش بھی انسان کی فطرت ہے۔اور انسان کی ہر فطرت کا اس پر حق ہے۔ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ دین کی دعوت صرف بشارتیں بن کر ہی نہ رہ جائے، بلکہ اس میں انذار بھی ہو اور تبشیر بھی تاکہ لوگوں کی زندگی خوف ورجاء میں گزرے۔خوف برائی سے روکتا ہے اور رجاء نیکی پر ابھارتی ہے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کا فقدان ہو تو معاملہ بگڑ جاتا ہے۔

دین پر عمل کرنے میں اصل چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہی اصل میں وہ طریقہ ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں صراط مستقیم کہا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کو پانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس کے سوا کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جس سے خدا تک پہنچا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ خود قرآن میں فرماتے ہیں: انی علی صراط مستقیم، میں تو بس سیدھے راستے پر ہوں، یعنی سیدھے اور آسان راستے پر۔ اللہ تعالیٰ کو پانے کے لیے کوئی پاپڑ بیلنے نہیں پڑتے، وہ تو ہر اس جگہ مل جاتا ہے، جہاں آدمی اس کی طرف رخ سیدھا کر لے۔

واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیء من الدلجۃ:

اس خوب صورت جملے کو اگر ہم تمثیل کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ آپ نے پورے دین پر عمل کرنے کی حالت کی اس جملے میں تصویر کھینچ دی ہے کہ اس مسافر کی طرح دین پر عمل کرو، جو اپنے سفر کا آغاز صبح سویرے کرتا ہے پھر دھوپ کی تلخی دیکھ کر ذرا رک جاتا ہے۔ پھر سورج ڈھلنے پر چل پڑتا ہے، رات کو آرام کرنے کے لیے پھر ٹھہر جاتا ہے۔ صبح صبح تڑکے ہی پھر اٹھ کر منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

مومن بھی ایک مسافر ہے۔ اسے بھی صبح و شام اپنا سفر اسی مسافر کی طرح جاری رکھنا ہے، کچھ چل لے تو کچھ دیر کے لیے سستا بھی لے۔ عام دنوں کے روزے رکھے تو کچھ دن وقفہ بھی کر لے، رات کو قیام کرے تو کچھ دیر سو بھی لے تاکہ جب بھی وہ دوسرا کام شروع کرے تو وہ تازہ دم ہو اور پوری دل جمعی سے وہ کام کر سکے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خلاصۂ بحث

ہمارا دین آسان ہے کیوں کہ یہ ہماری فطرت کے مطابق ہے۔ اور یہ کسی آدمی پر اس کی طاقت اور صلاحیت سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ دین پر چلنے کا صحیح طریقہ وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے۔ یہ طریقہ میانہ روی اور توازن پر مبنی ہے۔ اس میں جو اضافہ کر کے سختی کرنا چاہے گا دین اسے ایسی شکست دے گا کہ اسے دین دنیا سے بھگا دے گا۔ وہ شیطان کے چنگل میں ایسا پھنسے گا کہ پھر وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی نہیں ہو سکتا۔ آدمی کو اس انجام سے بچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس کی تاکید کی ہے کہ میرے طریقے کی پیروی کرو۔ اسی طریقے کے قریب رہو۔ دین کی دعوت دو تو جب بھی ضروری ہے کہ میری طرح اپنی دعوت میں انذار و تبشیر کے پہلو سے بھی ایک توازن رکھو۔

اس توازن کو اس مسافر کے سفر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، جو صبح سویرے سفر شروع کرے، پھر دھوپ میں تلخی محسوس کرے تو رک جائے، دن ڈھلے تو پھر چل پڑے، رات آئے تو سو جائے اور صبح پھر منہ اندھیرے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔

اور جو شخص اس توازن کو بگاڑے، یہ بگاڑ خواہ کمی کی صورت میں ہو یا اضافے کی صورت میں، دونوں میں اس کے لیے رسوائی ہے۔ جو دین میں اضافہ کرے اس کے لیے بھی اور جو کمی کرے اس کے لیے بھی۔ کامیاب صرف وہی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی۔ اتباع سے مراد یہ ہے کہ کسی کی انگلی پکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے چلا جائے۔ جہاں وہ رک جائے وہیں رک جانا۔ جہاں سے وہ مڑ جائے وہیں مڑ جانا۔ قرآن میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ. (آل عمران ۳:۳۱)

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پروفیسر خورشید عالم

ام الکتاب، کتاب مکنون، لوح محفوظ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ماہنامہ ''ضرب حق'' کے مدیر مولانا سید عتیق الرحمان گیلانی نے ڈاکٹر اسرار احمد کی طرف ایک قول منسوب کیا ہے کہ ''موجودہ قرآن اصل نہیں جس میں غلطیاں ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے ہفت روزہ ''ندائے خلافت'' بابت ۱۹ تا ۲۵ مئی کے سرورق پر وضاحت فرمائی ہے کہ قول کا پہلا حصہ تو میرے موقف کی غلط تعبیر ہے اور دوسرا حصہ سراسر بہتان ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ اصل قرآن لوح محفوظ (سورۂ بروج) کتاب مکنون (سورۂ واقعہ) اور ام الکتاب (سورۂ زخرف) میں ہے، ہمارے پاس جو مصاحف ہیں، اسی کی مصدقہ نقول ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ بھارت کے ایک عالم دین کے کہنے پر ایسا کہنے سے رک گئے ہیں، مگر تین آیات مبارکہ کا جو حوالہ دیا گیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علمی طور پر اپنے موقف کو درست سمجھتے ہیں۔ میں نے ان آیات مبارکہ کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کا موقف علمی طور پر درست نہیں۔

ام الکتاب کی ترکیب قرآن حکیم میں تین بار ۳:۷، ۱۳:۳۹، ۴۳:۴ میں ستعمال ہوئی ہے۔

لفظ ام کے بارے میں امام راغب کا قول ہے کہ ہر اس چیز کو ام کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے وجود یا اس کی تربیت یا اس کی اصلاح یا اس کی ابتدا کے لیے بطور اصل اور بنیاد ہو۔ پس ام درحقیقت وہ اصل ہے جس سے دوسری چیزیں نکلتی ہیں۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں اصل بمقابلہ نقل کے نہیں ہے، بلکہ اصل اساس اور بنیاد کے معنوں

میں ہے۔محکم آیات مقصود بالذات ہیں، وہ اصول دین ہیں اور متشابہات کو ان کی مدد سے سمجھا جاتا ہے، اس لیے وہ متشابہات کے لیے بمنزلۂ ام ہیں۔ سورۂ فاتحہ کو ام القرآن یا ام الکتاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے قرآن حکیم کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ محکمات یا سورۂ فاتحہ اصل ہے اور باقی آیات یا قرآن ان کی مصدقہ نقل ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے عرب دماغ کو 'أم الرأس' کہتے ہیں۔

امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ ''ام الکتاب'' (۶۶:۱۹) کے بارے میں مفسرین کے دو بڑے قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ ''اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ عالم علوی و سفلی کے تمام واقعات اس میں محفوظ ہیں اور قیام قیامت تک تمام واقعات کو اس میں درج کیا گیا ہے۔'' اکثر مفسرین نے ام الکتاب سے مراد لوح محفوظ (Preserved Tablet) لی ہے۔ اس اعتبار سے وہ نہ صرف قرآن، بلکہ تمام کتب سماویہ کی ماں ہے یعنی اصل اور بنیاد ہے۔ اس میں صرف آسمانی کتابیں ہی نہیں ہیں، بلکہ یہ اللہ کے فرامین واحکام اور ان واقعات کا مخزن ہے جو اللہ کی مشیت کے تحت پہلے ہوئے اور آیندہ ہونے والے ہیں۔ اللہ نے کیا پیدا کرنا ہے اور بندوں نے کیا کرنا ہے، سب اس میں موجود ہے۔ یہ کتاب ہر قسم کی دراندازی، کمی بیشی اور تغیر وتبدل سے محفوظ ہے۔ اس کا تعلق غیبیات سے ہے۔ اللہ کے سوا اس کی 'کنہ' کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ ہمارے ادراک سے ماورا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ زیر بحث نکتے سے تعلق رکھنے والی اہم بات یہ ہے کہ لوح محفوظ صرف قرآن کی اصل نہیں، بلکہ یہ ماضی اور مستقبل کے سب واقعات کا ریکارڈ ہے، اس لیے اسے قرآن مجید کی اصل اور موجودہ قرآن مجید کو اس کی مصدقہ نقل قرار دینا قرین قیاس نہیں۔

لوح محفوظ پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اللہ تو علام الغیوب ہے، اسے کیا ضرورت ہے کہ عرش کے دائیں ہاتھ لوح محفوظ کو رکھے۔ یہ ضرورت تو اسے پڑتی ہے جسے بھول چوک کا خدشہ ہو۔ اللہ تو ایسا ہے کہ 'لا یضل ربی ولا ینسی' ''میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔'' (۲۰:۵۲) امام رازی کہتے ہیں کہ جب اللہ نے مخلوقات کے واقعات کو اس میں درج کیا اور فرشتوں نے دیکھا کہ سب واقعات اس نوشتہ کے مطابق رونما ہو رہے ہیں تو ان کو اللہ کی کمال حکمت وعلم کا پتا چلا۔ گویا کہ لوح محفوظ میں حکمت یہ تھی کہ فرشتوں کو بتایا جائے کہ تمام واقعات تفصیلاً اللہ کے علم میں ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ''ام الکتاب سے مراد علم الٰہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر موجود اور غیر موجود کے بارے میں علم رکھتا ہے۔ اس کا علم ابدی و ازلی ہے جو فنا و تغیر سے پاک ہے۔ سب احکام کا سرچشمہ علم خداوندی ہے اور وہ ہر قانون

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی بنیاد اور اصل ہے۔'' ابن عباس سے مروی ہے کہ انھوں نے ابی سے ام الکتاب کے بارے میں پوچھا: انھوں نے جواب دیا: ''اللہ کا علم کہ وہ کیا پیدا کرنے والا ہے اور اس کی مخلوق کیا کرنے والی ہے۔ پھر اس نے اپنے علم سے کہا کہ کتاب بن جا، پس وہ کتاب بن گئی۔'' تفسیر قرطبی میں کعب الاحبار کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ام الکتاب سے مراد ان مخلوقات کے بارے میں اللہ کا علم ہے جو اس نے پیدا کیں یا پیدا کرنے والا ہے۔ تفسیر روح المعانی، تفسیر مراغی اور عبدالکریم الخطیب کی التفسیر القرآنی للقرآن میں اسی قول کو اختیار کیا گیا ہے۔

ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ ام الکتاب سے مراد علم الٰہی ہے جو خارجی اثرات سے محفوظ اور فنا و تغیر سے پاک ہے۔ جو کچھ فرشتوں کے صحیفوں میں لکھا ہوتا ہے، وہ اللہ کے علم کے مطابق ہوتا ہے، اس لیے وہ بمنزلۂ ام کے ہے، کیونکہ وہ ہر چیز کا مرجع ہے۔ اس قول کے مطابق اصل اور مصدقہ نقل کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ کتاب صرف علم الٰہی میں محفوظ نہیں، بلکہ ہمارے پاس اصل صورت میں بھی محفوظ ہے۔

لوح محفوظ اور علم الٰہی، دونوں اصل میں ایک ہی ہیں۔ لوح محفوظ علم الٰہی کا تمثیلی بیان ہے۔ سید قطب شہید سورۂ زخرف کی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''ہم ام الکتاب کے لفظی مدلول کی بحث میں نہیں پڑتے۔ آیا اس سے مراد لوح محفوظ ہے یا علم ازلی، دونوں ایک ہیں۔ دونوں اس کلی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں قرآن بلند و برتر اور حکمت والا ہے۔'' قرآن مجید کی دو آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ علم الٰہی ہی لوح محفوظ ہے۔ سورۂ انعام میں ہے: ''اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا، مگر وہ اسے جانتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز گرتی ہے، مگر یہ سب ایک کھلی کتاب میں ہے[1]۔''

امام رازی کہتے ہیں کہ کھلی کتاب سے مراد علم الٰہی ہے اور بعض مفسرین اس سے مراد لوح محفوظ بھی لیتے ہیں۔ سورۂ حج میں ہے: ''اے مخاطب! کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو جانتا ہے جو زمین و آسمان میں ہیں اور بے شک، یہ بات ایک کتاب میں ہے۔'' (۲۲: ۷۰) امام راغب کا قول ہے کہ لوح محفوظ کو کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ابومسلم اصفہانی کے قول کے مطابق کتاب سے مراد حفظ و ضبط ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کا علم محفوظ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اسے علم الٰہی کہیں یا لوح محفوظ ایک ہی بات ہے۔ ان آیات میں پہلے اللہ کے علم کا بیان ہے، پھر اسے کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بتانا مقصود ہو کہ جس طرح لکھی ہوئی چیز قطعی، یقینی اور محفوظ ہوتی ہے بالکل اس

---

[1] ۶:۵۹۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طرح علم ازلی قطعی، یقینی اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہے۔

لغوی لحاظ سے 'لاح' 'یلوح' 'لوحاً' کے معنی ہیں ظاہر ہونا۔ یعنی لوح سے مراد وہ چیز ہے جو فرشتوں پر ظاہر ہوتی ہے اور انھیں اوامر و نواہی کا پتا بتاتی ہے، پھر وہ ان کو نافذ کرتے ہیں۔ چنانچہ فیوّمی نے ''المصباح المنیر'' میں لوح محفوظ کے بارے میں ایک قول نقل کیا ہے کہ 'انہ نور یلوح للملائکة فیظهر لهم ما یؤمرون فیأتمرون'۔ (یہ ایک نور ہے جو فرشتوں کو دکھائی دیتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ ان کو کس بات کا حکم دیا گیا ہے پس وہ حکم بجالاتے ہیں)۔

ام الکتاب کے بارے میں یہ دو بڑے اقوال ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ علما نے اس سے مراد قرآن لیا ہے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ ام الکتاب سے مراد بذات خود قرآن ہے۔ امام طبری نے ابن جریج کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد الذکر ہے۔ لسان العرب میں ابن عباس کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اول سے لے کر آخر تک قرآن ہے۔

کتاب مکنون (۵۶: ۷۸) سے مراد لوح محفوظ بھی لی گئی ہے، مگر تفسیر قرطبی میں مجاہد کا قول نقل ہوا ہے کہ اس سے مراد وہ مصحف ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس صورت میں اس کی مثال یہ عربی محاورہ ہے: 'انہ کریم فی بیتہ'، یعنی 'انہ رجل کریم وهو فی بیتہ'، یعنی وہ سخی ہوتا ہے، جبکہ وہ اپنے گھر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اس آیت کی تقدیری عبارت یوں ہے: 'انہ لقرآن کریم وهو فی کتاب مکنون' (بے شک وہ ایک مکرم قرآن ہے، جبکہ وہ محفوظ کتاب میں ہو)۔ اس اعتبار سے واحدی کی رائے میں کتاب مکنون قرآن ہی کی صفت ہے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ کتاب مکنون سے مراد تورات و انجیل ہے۔ گویا کہ کہا یہ گیا ہے کہ اس کا ذکر اس کتاب میں ہے جس کا شرف محفوظ ہے یعنی آسمانی کتابیں اس کی شہادت دیتی ہیں۔ تفسیر ابن قیم میں جسے اویس ندوی نے مرتب کیا ہے، کتاب مکنون کے بارے میں ایک اور رائے دی ہے کہ اس سے مراد وہ صحیفے ہیں جو فرشتوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی رائے کی تائید میں بہت سے دلائل دیے ہیں۔ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ امام مالک نے موطا میں کہا ہے کہ 'کتاب مکنون ... لا یمسہ الا المطهرون' کی بہترین تفسیر جو میں نے سنی ہے وہ یہ ہے کہ اس جیسی آیت سورۂ عبس (۸۰: ۱۳۔ ۱۶) میں موجود ہے۔ اگر کتاب مکنون سے مراد قرآن کریم یا فرشتوں کے صحیفے لیے جائیں تو اس بات کا کوئی امکان نہیں رہتا کہ اصل لوح محفوظ میں ہے۔ لوح محفوظ کے بارے میں اوپر واضح ہو چکا ہے کہ وہ ماضی کے اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا ایک دیوان ہے۔ اللہ کا

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سارا علم اسی کی طرف منسوب ہے۔ اس میں واقعات کا ایک تسلسل ہے۔ وہاں علیحدہ علیحدہ کتب سماویہ کی اصل نہیں رکھی ہوئی ہے کہ ہم اس کی مصدقہ نقل کا تصور کریں۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے خلق خدا کے خوف سے اگر اپنے قول سے رجوع کیا ہے تو اچھا کیا ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ علمی طور پر بھی وہ اس سے رجوع کر لیں، کیونکہ پیش کردہ آیات میں سے کوئی آیت ان کے نظریہ کی تائید نہیں کرتی۔ قرآن کریم علم الٰہی میں بھی محفوظ ہے اور ہمارے پاس کتابی شکل میں اپنی اصلی حالت میں بھی محفوظ ہے۔

میں محترم ڈاکٹر صاحب کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ اصل اور نقل کے اس مسئلہ نے امام داؤد ظاہری کو عجیب وغریب رائے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ جو قرآن ہمارے سامنے ہے، وہ محدث اور مخلوق ہے، اس لیے اسے جنابت والا ناپاک آدمی بھی چھو سکتا ہے، جبکہ وہ قرآن جو لوح محفوظ میں ہے، وہ قدیم اور غیر مخلوق ہے اور اس پر 'لا یمسہ الا المطھرون' (۵۶:۷۹) ''سوائے پاک لوگوں کے اسے کوئی نہیں چھوتا'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ دیکھا بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ امام احمد بن حنبل نے اس رائے کی سختی سے مخالفت کی۔ و باللّٰہ تعالیٰ التوفیق۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ساجد حمید

بدگمانی کیا ہے، اس سے کیسے بچیں؟

—— ۲ ——

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بدگمانی کے نفسیاتی اسباب

اس فصل میں ہم ان نفسیاتی محرکات کا ذکر کریں گے، جو ہمیں بدگمانی پر ابھارتے ہیں۔ ان محرکات کو جان کر ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ ہمارے گمان کس قدر خودساختہ ہوتے ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

دوسرے یہ کہ ہم ان مواقع سے بھی واقف ہو جائیں گے، جن میں ہم گمانوں کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ واقفیت ہمیں ان مواقع پر خبردار کرے گی، جس کی وجہ سے ہم چوکنے ہو کر گمانوں سے بچ سکیں گے۔

ذہن کی فعالیت

یہ انسانی ذہن کا خاصہ ہے کہ وہ سوچتا ہے۔ اس کی سوچ کے دائروں میں سب سے مرغوب عمل چیزوں کو سبب اور مسبب، چھوٹے اور بڑے، اصل اور فرع اور اس طرح کے کئی رشتوں میں جوڑنا ہے۔ دنیا کا ہر انسان چیزوں کے

مابین یہ رشتے بناتا اور توڑتا رہتا ہے۔ اگر آدمی کی سوچیں بلند نہ ہوں تو پھر وہ حقیر اور فضول چیزوں میں یہی کام کرے گا۔ مثلاً فلم بین فلمی کہانیوں پر اس طرح کی گفتگو اپنے اور اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا رہے گا۔ اور اگر آدمی عام دنیوی امور جیسے کاروبار یا گھر چلانے جیسی عملی سوچیں بھی نہ رکھتا ہو، تو پھر اس کا ذہن لوگوں کے محرکات واعمال کی سوچوں میں گم رہے گا۔ ان کے جملوں، تبصروں اور حرکات وسکنات پر وہ یہ عمل کرتا رہے گا۔ چنانچہ اس کی سوچوں کا محور یہ گمان ہوں گے۔ وہ ہر عمل کا سبب ڈھونڈے گا، وہ اس کے محرکات تک پہنچے گا اور پھر ان گمانوں پر اپنے ذہن رسا کو داد دے گا کہ میں نے یہ بہت اعلیٰ نتیجہ نکالا ہے۔ اور خود ہی بلاثبوت دوسروں کو مجرم بناتا رہے گا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ محض جسمانی کام ذہن کو ان سوچوں سے نہیں روکتا۔ آپ گاڑی چلا رہے ہوں، کھانا پکا رہے ہوں، یا کچھ اور اس طرح کا کام جس میں ذہن کا استعمال محض سرسری سا ہو تو ذہن ایسے کاموں کے موقع پر بھی چلتا رہتا ہے۔ اور آپ کہانیوں پر کہانیاں سوچتے چلے جاتے ہیں۔ ذہن کو یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے تخلیقی عمل کے لیے دی ہے۔ ہم تجزیات کریں، حقائق کو جانیں ان پر غور کریں اور سبب اور مسبب کے رشتے تلاش کرتے کرتے خدا کو دریافت کریں، خدا کی اس کائنات میں سے اپنے لیے مفید مطلب چیزیں اور اصول ڈھونڈیں، جو ہمارے لیے نور اور روشنی بنیں، اور ہم خدا کو پہچان سکیں اور اس دنیا کی حقیقت جان سکیں۔ لیکن ہم اپنی اس صلاحیت کو نہایت ہی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں صرف کر کے ضائع کر دیتے ہیں۔

ان صلاحیتوں کو صحیح رخ پر لگانے کے لیے ہمیں کیا کچھ کرنا چاہیے وہ ہم بدگمانی سے بچنے کے طریقوں پر گفتگو کرتے ہوئے بتائیں گے۔ یہاں بس اتنا جان لیجیے کہ اللہ نے آپ کو ایک تیز، باصلاحیت ذہن دیا ہے، جسے آپ کو اعلیٰ اور مفید کاموں میں صرف کرنا چاہیے۔

دماغ کی اسی فعالیت کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ چونکہ اللہ نے ہمیں اس طرح سے بنایا ہے کہ ہم تجربات سے اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں، پھر ان اضافوں کا ہمارا ذہن تجزیہ کرتا اور ان کے اصول بناتا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہوا اور وہ اس وجہ سے وغیرہ۔ چنانچہ ایک ہی ماں کے گھر پیدا ہونے والے بچے اپنے تجربات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف چیزیں سیکھتے چلے جاتے ہیں۔ ذہن جو کچھ سیکھتا ہے، پھر اسی کے مطابق ہمیں مشورے دیتا ہے۔ مثلاً موٹر مکینک کی گاڑی خراب ہو تو اس کا ذہن اسے کچھ اور بتائے گا اور ہمارا ذہن ہمیں کچھ اور۔ ٹھیک ایسے ہی خدا سے اچھی طرح واقف اور اس کی صفات اور سنن کو جاننے والے کا ذہن رنج وغم میں اور طرح سے چلے گا اور ان چیزوں سے ناواقف آدمی کا ذہن اور طرح سے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں نے یہ بات اس لیے کی ہے کہ بدگمانی کرنے والے کا ذہن اور طرح سے چلے گا اور بدگمانی نہ کرنے والے کا ذہن کچھ اور طرح سے۔ چنانچہ بدگمانی کرنے والے نے اپنے گمانوں کے ذریعے سے جو ذہن دوسروں کے بارے میں بنا رکھا ہوگا وہ اس کے مطابق آپ کو رویہ اپنانے کا مشورہ دے گا۔ اگر آپ نے اس کے بارے میں کوئی برا گمان کر رکھا ہے تو مثلاً ہوسکتا ہے کہ آپ اس سے خندہ پیشانی سے نہ ملیں۔ اس لیے کہ آپ کے گمانوں نے آپ کے دل کو اس کے بارے میں میلا کر رکھا ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے ذہن کی اس فعالیت کو قابو میں رکھا جائے۔ اور خواہ مخواہ، بلا بنیاد اور اپنے ہی خیالات پر مبنی آرا دوسروں کے بارے میں قائم نہ کریں اور نہ ذہن کو ایسے کاموں میں فعال ہونے دیں ورنہ وہ اسی سمت میں چلتا رہے گا۔ اور آپ کے اخلاق پر اثر انداز ہو کر آپ کو جہنمی بنا دے گا۔

نقصان اٹھانے کا رنج وغصہ

گمان کے نفسیاتی محرکات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی دوسروں کے بارے میں اس وقت بدگمانی کرتا ہے، جب اسے ان سے نقصان پہنچے اور وہ غم وغصہ کا شکار ہو۔ غم اور غصہ ایک عام سی چیز ہے۔ مگر نفس کا شیطان اس غم وغصہ کی تسکین کے لیے ہمیں اس شخص کے بارے میں سوچنے پر ابھارتا ہے۔ ہم دل ہی دل میں اس کے فعل کے محرکات کو متعین کرنے لگ جاتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

چونکہ ہم غصہ میں اور اپنے نقصان پر غم زدہ ہوتے ہیں، اس لیے عموماً اسی غم وغصہ کے تحت رائے بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ اس بات کا پورا امکان ہوتا ہے کہ اس شخص نے وہ کام اس محرک کے تحت نہ کیا ہو۔ ہم ایک مثال لیتے ہیں۔ عام طور سے اگر کسی سے ہمارا نقصان ہو جائے تو ہم اسے ایک انسانی غلطی ماننے کے بجائے فوراً یہ تبصرہ دل میں یا کسی کے سامنے ضرور کر دیتے ہیں کہ میرا پیسا تھا اسے اس کی کیا پروا! یہ بظاہر ایک بے ضرر معمولی سا تبصرہ ہے، مگر حقیقت میں دیکھیں تو یہ ایک بدگمانی ہے۔ اس کے اثرات سنگین ہیں۔ یہ آپ کے اگلے رویوں کو متعین کر دے گا۔ یہ بات آپ کو اس وقت تک نہیں کہنی چاہیے جب تک آپ کو اس کی باتوں اور اس کے عمل سے معلوم نہ ہو جائے کہ یہ غلطی اس نے بشری کمزوری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے کی ہے کہ یہ پیسا اس کا نہیں آپ کا تھا اور اپنے پیسے کے بارے میں وہ قطعی ایسا نہ کرتا۔

یہ نقصان اور رنج ہی سے پیدا ہوتا ہے، مگر یہ نقصان مال اور پیسے کا نہیں، بلکہ یہ وہ نقصان ہے جو آپ کی شخصیت کو لاحق ہوتا ہے۔ کوئی آپ سے آگے بڑھ رہا ہے، کوئی آپ سے جیت رہا ہے۔ کوئی آپ سے زیادہ اچھا سمجھا جاتا ہے، کوئی خوب صورت زیادہ ہے۔ غرض بہت سارے پہلو ایسے ہیں، جن میں آپ حسد کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ حسد بدگمانی پیدا کرنے میں سب سے زیادہ موثر شیطان ہے۔ یہ نیک سے نیک آدمی کے بارے میں آپ کی رائے بگاڑ کر رکھ دے گا۔ اس کی ہر کامیابی کو آپ اپنے خلاف ایک سازش سمجھنے لگیں گے۔ یا اس کی کامیابی کو اس کی چال بازی کا مرہون منت قرار دیں گے۔ کبھی دوسروں کے بارے میں جو اس شخص کو پسند کرتے ہیں، کوئی منفی تبصرہ کر دیں گے۔

یہ باتیں حسد کی صورت میں آپ کے دل کو سکون پہنچائیں گی۔ آپ ایسا سوچ کر دراصل اسے اپنی نظروں میں اس مقام سے گرائیں گے، جو اسے دنیا میں ملا، اس طرح آپ نے اپنے لیے جھوٹی تسکین حاصل کر لی۔ لیکن درحقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ آپ نے اس کے بارے میں کچھ گمان اور خیال دل ہی دل میں باندھے ہیں۔

ایک طرف آپ ایک رنج کا شکار ہوئے ہیں اور دوسری طرف آپ بدگمانی سے خدا کی نظروں میں برے بن رہے ہیں۔ حسد اگر ان چیزوں میں پیدا ہوا جو دوسرے شخص کو اللہ نے دی ہیں تو اس میں اس شخص کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مثلاً بولنے کی صلاحیت، شکل وصورت، خاندان، قد کاٹھ اور دولت وغیرہ۔ اگر وہ چیزیں ایسی ہیں جو اس نے اپنی محنت سے کمائی ہیں تو اس میں ضروری نہیں ہے کہ آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے ایسا کیا ہو۔ آپ کے لیے ان چیزوں میں جو اس نے اپنی محنت سے کمائی ہیں، دو طرح کی ہوں گی۔ ایک وہ جنھیں آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں، اور دوسرے وہ جنھیں آپ حاصل نہیں کر سکتے۔

چنانچہ جو چیزیں آپ حاصل کر سکتے ہیں اسے حسد کا شکار ہوئے بغیر حاصل کریں، اور وہ چیزیں جو آپ حاصل نہیں کر سکتے تو کیا ہوا اس کے لیے بھی بہت سی ایسی چیزیں ہوں گی جو اللہ نے آپ کو دی ہوں گی، مگر اس کے پاس نہیں ہوں گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ان چیزوں میں ترقی کریں، جو اللہ نے آپ کو دی ہیں اور اس کا حسد ترک کر دیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ یہ جائزہ لیں کہ کہیں آپ نے مقابلے کا میدان تو غلط متعین نہیں کر لیا ہے۔ یعنی جس سے آپ حسد کر رہے ہیں، وہ میدان تجارت کی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوا، مگر آپ میدان سیاست کے آدمی تھے، لیکن تجارت کے میدان میں قوت آزمائی کرنے لگے ہیں، تو جان لیجیے کہ آپ کبھی اس کے مقابلے میں پورے نہیں اتر سکتے۔ اس صورت میں آپ کو اپنی شخصیت کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق میدان زندگی منتخب

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کرنا ہوگا۔

اور اگر آپ کسی وجہ سے یہ میدان نہیں چھوڑ سکتے تو پھر صبر کے ساتھ حسد سے نکل کر ہنسی خوشی رہنا ہوگا۔ ورنہ آپ دوسرے نقصانات کے ساتھ ساتھ بدگمانیوں کے چکروں میں ایسے الجھیں گے کہ جو کچھ آپ کر سکتے تھے وہ بھی نہیں کر پائیں گے۔ اور اسی طرح یہ چیز آپ کو کبھی اس شخص سے استفادہ کرنے کے قابل نہیں رہنے دے گی۔ جس کے نتیجے میں آپ اس کی خداداد صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائیں گے وغیرہ۔

یہود کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر حسد پیدا ہوا اور اس حسد میں وہ بڑھتے چلے گئے۔ اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ خدا کے مقرب ترین فرشتے حضرت جبرائیل امین کے بارے میں بدگمانیاں کرنے لگے کہ یہ ہمارا دشمن ہے اس نے جان بوجھ کر عربوں کے ایک آدمی کو نبوت دے دی ہے۔

اس کے نتیجے میں وہ نہ صرف ان فوائد سے محروم ہوئے جو انھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل ہو کر ملتے، بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے اس نعمت سے محروم ہو گئے، جو ان کے لیے نجات کا ذریعہ بنتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تکبر یا احساس برتری

بدگمانی کا ایک اور سبب تکبر بھی ہے۔ تکبر کے معنی اپنے آپ کو دوسروں کے مقابل میں برتر و بالا سمجھنا اور انھیں حقیر سمجھنا ہے۔ یہ دوسرا حصہ بدگمانی کی بنیاد بنتا ہے۔ دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا، یہ بہت سارے برے گمانوں کو پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض بزرگ، جو محض اپنے آپ کو اچھے معنی میں بھی بڑا سمجھنے کی بنا پر (یعنی تکبر نہ بھی ہو، مگر اپنے آپ کو عمر وغیرہ میں بڑا سمجھ لینے والے بھی) اس طرح کی بدگمانیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ان سے ملنے نہ جائے تو وہ اسے اس کے کسی منفی جذبے سے تعبیر کریں گے۔ جیسے وہ کہیں گے: ''وہ بڑا بنتا ہے'' یا ''اسے میری قدر نہیں ہے'' وغیرہ۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے کوئی اور ہی مسائل ہوں، جن کی وجہ سے وہ نہ آ رہا ہو۔

ماں باپ، بزرگ اعزہ، اساتذہ اور وہ لوگ جو کسی نہ کسی معنی میں دوسروں سے بڑے ہوں، تو ان کو یہ شکایات بالعموم پیدا ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ محض ان کے گمان ہوتے ہیں۔ جب ایک مثبت سطح کی حقیقی بڑائی بدگمانیوں کے اتنے گمان پیدا کر سکتی ہے تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تکبر میں مبتلا شخص کس درجے میں اس مرض کا شکار ہوگا۔

تکبر ایسا مرض ہے کہ اس کے بعد آدمی دوسروں کو حقارت سے دیکھنے لگتا ہے۔ ان کے عمل کی خوبی، ان کی نیک نیتی، ان کی سیرت کی برتری، سب ایسے شخص کے ہاں بے معنی قرار پاتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ان کے اعمال کو بری نگاہ

سے دیکھتا ہے۔ وہ ان کی خدمت کر رہے ہوں، تو یہ مطلب پرستی ہوتی ہے، وہ اس سے اختلاف کر رہے ہوں تو یہ ان کی کند ذہنی ہوتی ہے وغیرہ۔

مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت غریبوں میں پھیلتی ہے تو سرداران قریش کے تکبر کو یہ چیز آپ کی دعوت کی کم تری کا ثبوت لگتی ہے۔ چنانچہ ایسا آدمی ہر چیز کو تکبر کی نگاہ سے دیکھ کر اس کی حقارت ہی کا فیصلہ کرتا ہے اور یہی چیز بدگمانی کا سبب بن جاتی ہے۔

کمزوری

گمانوں کا شکار کرنے والا ایک محرک ہماری کمزوری بھی ہے۔ خواہ وہ دوسروں کے مقابلے میں ہو، یا محض ہمارا ایک نقص ہو۔ مثلاً کوئی مرض، کوئی نقص ہمیں اس جگہ رکھ دیتا ہے کہ ہم وہموں اور گمانوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اچھے برے خیالات ہمارے ذہن پر حملہ آور ہوتے ہیں، اور ہم اپنی کمزوری کی بنا پر ان کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ مریض بالعموم اپنے گھر والوں سے الجھ رہے ہوتے ہیں کہ میری کسی کو پروا نہیں ہے۔ حالانکہ ان کی تیمارداری پوری طرح کی جارہی ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مرض کی وجہ سے ایک کمزور حالت میں ہوتے ہیں۔ ان کی توقعات بڑھ جاتی ہیں۔ دوسروں پر ان کا انحصار زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ محتاجی انھیں دوسروں کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کرتی ہے۔ چنانچہ انھیں اپنی طرف دوسروں کا عدم التفات ایک برا سلوک دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ ان کے بارے میں برا سوچنے لگ جاتے ہیں۔ اس لیے اس بات پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ جو اس محتاجی میں آپ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ان کے اپنے بھی کام ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی ذات کے بھی مسائل ہیں۔ اگر وہ آپ کے بارے ہی میں سوچتے اور عمل کرتے رہیں تو یہ ناممکن ہے۔

برائی کا عادی ہونا

جو لوگ دھوکا، حیلہ بازی اور مکر و فریب کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے بارے میں بھی یہی سوچتے ہیں کہ یہ لوگ بھی انھی وجوہات سے ایسا کرتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ ہم ایسے بہت سے لوگوں سے ملیں گے کہ وہ دوسروں کے بارے میں ایسے عجیب و غریب تبصرے کرتے دکھائی دیں گے کہ آدمی دنگ رہ جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان تبصروں کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ ان کا اپنا سوچنے کا انداز ایسا ہوتا ہے۔ وہ اپنی مطلب براری کے لیے کہیں خوشامد کر رہے ہوں گے تو کہیں دھوکا وفریب کی بساط بچھا رہے ہوں گے۔ اس لیے جب دوسروں کو کسی کی تعریف کرتے دیکھیں گے تو انھیں گمان ہوگا کہ وہ خوشامد کر رہا ہے۔ سارے لوگ ایسے نہیں ہوتے، ان کے جینے کا طریقہ لازم نہیں کہ آپ جیسا ہو۔ ان کے مطلب براری کے گر ضروری نہیں کہ وہی ہوں جو آپ اختیار کرتے ہیں۔

غلط فہمی

یہ اگرچہ خالص نفسیاتی محرک نہیں ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ اکثر معاملات میں اوپر کے تمام اسباب ومحرکات جو میں نے بیان کیے ہیں، وہ صرف اس وجہ سے عمل میں آتے ہیں کہ ان کے پیچھے ہماری غلط فہمی کارفرما ہوتی ہے۔ یعنی غلط فہمی اوپر کے تمام نفسیاتی محرکات کو جگا دینے کا باعث بن جاتی ہے۔

غلط فہمی یہ ہے کہ ہم اپنے کسی بھائی کے کسی قول یا عمل کو غلط سمجھ لیتے ہیں۔ جس کی کچھ مثالیں اوپر گزری ہیں۔ بعض اوقات آپ محض مذاق کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ دوسرے کے لیے طعنہ بن جاتا ہے۔ آپ ایک تنقید کر کے اصلاح کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں، مگر وہ دوسرے کے لیے تکلیف دہ اہانت بن جاتی ہے۔ یہ سب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ آپ کی بات کو صحیح نہیں سمجھا گیا ہوتا۔ اس کے اسباب کئی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کے الفاظ صحیح نہیں تھے، یا آپ کا لہجہ غلط تھا، یا آپ نے جو موقع اس بات کے لیے منتخب کیا وہ درست نہیں تھا، یا جو موضوع آپ نے چھیڑا وہ اس کے اور آپ کے تعلق کے لحاظ سے موزوں نہ تھا، غرض اس غلط فہمی کے پیدا کرنے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔

اس لیے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم نے یہ سوال چھیڑ کر غلطی تو نہیں کی، اور اس کے رویے کی غلطی کو دیکھ کر معافی مانگنی چاہیے۔ اس لیے کہ اگر اس کا رویہ خراب ہوا ہے تو اس میں ہمارا قصور بھی ہے۔ اسی طرح جس کو غلط فہمی ہوئی ہے اس کو بھی یہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ شخص میری برائی ہی کر رہا ہو۔ یہ میرا خیر خواہ بھی ہو سکتا ہے۔

خوف

خوف بھی گمانوں کا محرک ہے۔ آدمی جب اپنے آپ کو خطرے میں پاتا ہے تو طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے اقدامات کا جائزہ لیتا ہے جن کے ذریعے سے اس کو خیال ہوتا ہے کہ وہ اس مشکل میں پھنسا ہے اور پھر ان کے بارے میں طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ سورۂ احزاب

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں منافقین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ غزوۂ احزاب نے کس طرح منافقین کے دلوں میں بدگمانیوں پر بدگمانیاں پیدا کیں کہ وہ اللہ کے بارے میں بھی برے گمان دل میں پالنے لگے (۳۳: ۱۰)۔

گمانوں سے بچنے کا طریقہ

انسان کیا ہے؟

بدگمانی سے بچنے کا طریقہ جاننے سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ انسان کیا ہے۔ انسان قرآن مجید کی روشنی میں کسی شیطان کا تخلیق کردہ نہیں ہے۔ اسے خالق کائنات نے وجود بخشا ہے۔ جو منبع خیر و صلاح ہے۔ اس اعتبار سے سب انسان ایک ہی خالق کی مخلوق اور اس کی دی ہوئی فطرت پر بنائے گئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انسان صاحب خیر مخلوق

قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب انسان اچھے ہیں۔ ان کے خمیر میں نیکی اور خیر و صلاح رکھی گئی ہے۔ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہے جس کی سرشت میں شیطنت ہو۔ نہ کوئی انسان فتنہ و فساد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ سب کو ایک جیسی صفات دی گئی ہیں۔ البتہ آزمایش کے لیے مزاج مختلف رکھے گئے ہیں۔ مثلاً غصہ سب میں ہے، مگر کسی میں زیادہ ہے اور کسی میں کم۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ آدمی برا ہے۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما میں غصہ اور نرمی کا فرق نمایاں تھا۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ غصہ کی وجہ سے برے تھے۔ یہ صرف ان کے لیے آزمایش تھی جس میں وہ کامیاب ہوئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نرمی ان کے لیے آزمایش تھی وہ بھی اس میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے غصہ کو حق کے لیے استعمال کیا، اور باطل کے خلاف فاروق بن گئے اور انھوں نے نرمی کو حق کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا اور صدیق کہلائے۔

بس سب انسانوں کا یہی معاملہ ہے ان کو سب کچھ دیا گیا ہے، مگر مقدار کا فرق ہے تاکہ ان کو آزمایا جائے۔ یہ آزمایش مزاج کی ان کم و بیش صلاحیتوں کے ساتھ حق پر قائم رہنے اور اس پر عمل کرنے کی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ کسی انسان کو شر زیادہ دے دیا گیا ہو۔ یا اسے خیر اور فطرت سے بالکل خالی رکھا گیا ہو۔ اس لیے کسی انسان کے

بارے میں یہ خیال تو سرے سے ہی غلط ہے کہ ''وہ تو ہے ہی شیطان'' اس لیے کہ یہ سب رحمٰن کے تخلیق کردہ ہیں۔ ان کے اندر بھی نیکی ہوگی، مگر بس کبھی دب جاتی ہے۔

اس بات کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کو خیر کی کیا کیا چیزیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں۔ اس تفصیل سے ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد ملے گی کہ انسان دراصل خیر کے لیے پیدا کیا گیا۔ اور اسے نیکی کا سبق کبھی بھولتا نہیں ہے۔ یہ بس وقتی اشتعال یا جذبہ کی تحریک ہوتی ہے جو کبھی تھوڑی اور کبھی طویل مدت کے لیے انسان کو بھٹکا دیتی ہے۔

فطرت

دنیا میں جتنے انسان پیدا ہوتے ہیں وہ فطرت پر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ دین قیم کا سبق لے کر آتے ہیں۔ اس فطرت میں بنیادی چیز توحید اور اس کی بندگی ہے۔ یہی فطرت انسان کے مذہبی شعور کو وجود بخشتی ہے۔ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس فطرت کے مطابق جو دین ہو اس کو اختیار کریں اور اس میں تبدیلی کرنے سے گریزاں رہیں۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ. (الروم ۳۰:۳۰)

''بس تم اپنا رخ، یکسو ہو کر، اللہ کے دین کی طرف پھیر لو۔ اس فطرت کی پیروی کرو، جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بگاڑنا جائز نہیں ہے۔ یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

یہ نہایت اہم اطلاع ہے۔ ہمیں سب انسانوں کے بارے میں یہاں یہ خبر دی گئی ہے کہ وہ شر پر تخلیق نہیں کیے گئے ہیں، بلکہ ان کی تخلیق میں خیر کو بنیادی جوہر اور فطرت کی حیثیت حاصل ہے۔ دین قیم ان کے اندر موجود ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب انسانوں میں، خواہ وہ پاکستانی ہوں یا ہندوستانی، مسلمان ہوں یا یہودی و عیسائی، ہندو ہوں یا مجوسی و پارسی یہ سب جب پیدا ہوئے تھے، تو سب کو یہی فطرت عطا کر کے پیدا کیا گیا تھا۔ نہ کوئی کافر تھا اور نہ کوئی مشرک، سب کے پاس ایک ہی دین تھا۔ لیکن جیسے جیسے ہم بڑے ہوئے ہم مسلمانوں نے اسلام کے رسوم و مناسک سیکھ لیے اور یہودیوں، ہندوؤں اور نصرانیوں وغیرہ نے اپنے اپنے دین کے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ان کی فطرت ان کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انبیا و صالحین کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہاتھوں کوئی ایمان نہ لاتا۔ ماحول مشرکانہ ہو، یا بداخلاقی سے بھرا ہوا یہ فطرت ہر شخص میں موجود رہتی اور اسے صلاح و خیر پر رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک ہندو، عیسائی اور یہودی، بے دین اور دین دار، ملحد اور موحد سب کے پاس یہ فطرت موجود ہوتی ہے۔ اسی کے مطابق چلنا نیکی و ہدایت ہے اور اس کی خلاف ورزی بے راہ روی اور گم راہی ہے۔ اس فطرت کے کچھ اجزا ہیں۔ ان کی تفصیل ہم ذیل میں کریں گے۔

عہدالست

یہ عہد اللہ نے ہم سے ہماری تخلیق کے بعد ہمیں دنیا میں بھیجنے سے پہلے لیا۔ قرآن مجید نے اس عہدالست کو یوں بیان کیا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ، مِنْ ظُهُوْرِهِمْ، ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰى، شَهِدْنَا، اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ، اَوْ تَقُوْلُوْٓا: اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ، وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ، اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ. (الاعراف ۷: ۱۷۲۔۱۷۳)

’’(اس بات کو یاد رکھ) جب تیرے رب نے بنی آدم سے، (یعنی) ان کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکالا، انھیں خود ان کے اپنے اوپر گواہ ٹھہرایا (اور پوچھا:) کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ وہ بولے ہاں (تو ہمارا رب ہے) ہم اس پر گواہ ہیں۔ (یہ ہم نے اس لیے کیا کہ) کہیں قیامت کو یہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔ یا یہ عذر کرو، پہلے ہمارے باپ دادا نے شرک کیا، اور ہم ان کی اولاد تھے، (چنانچہ انھی کی پیروی کی) تو کیا تو ہمارے ان باطل پرست (آبا) کے جرم میں ہمیں بھی ہلاک کر ڈالے گا۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ عہد فطرت انسانی کا ایک بڑا حصہ ہے جس کی وجہ سے یہ بات ہماری فطرت کا حصہ ہے کہ ہمارا ایک رب ہے۔ جس نے ہمیں تخلیق کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہمارا رب اور مخلوق کا رشتہ ہے۔ اور اس رشتے کا تقاضا ہے کہ ہم اس کو اپنا آقا و رب مانیں۔ وہ ہمارے گلہ کا رکھوالا ہے، وہ ہمارا رازق و مالک ہے۔ ہم اس کے اطاعت گزار و فرماں بردار ہیں۔ اس کے تخلیق کردہ ہونے اور اس کے رب ہونے کا تقاضا ہے کہ ہم اس کے وفادار رہیں۔

ہماری فطرت میں اس عہدالست کے ذریعے سے توحید اور رب واحد کا تصور رکھ دیا گیا ہے۔ اس بات میں مشرک و موحد سب یکساں ہیں۔ سب کے سینوں میں اصل سبق توحید ہی کا ہے۔ کوئی شخص پیدایشی طور پر مشرک و منکر

نہیں ہے۔ یہ اس کے اپنے خیالات ہیں، یا خارجی عوامل ہیں، جن کے زیر اثر وہ مشرک بنتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ یہاں فرما رہے ہیں کہ یہ فطرت اتنی صحیح اور قوی ہے کہ اس کے بعد یہ بہانہ سنا نہیں جائے گا کہ ہمارے آبا نے ایسا کیا تو ہم بھی گم راہ ہو گئے۔ اس سے نتیجہ خود بخود نکل رہا ہے کہ دنیا کے سب انسان فطرت توحید پر پیدا کیے گئے ہیں۔ کوئی اس معاملے میں ایسا نہیں ہے کہ جس کی سرشت میں شرک و بت پرستی اور اپنے رب سے بے وفائی رکھ دی گئی ہو۔

خیر وشر کا شعور

سورۂ دھر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّـا خَـلَـقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ، نَّبْتَلِيْهِ، فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا، اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا. (۷۶: ۲۔۳)

’’یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو ایک ملی ہوئی بوند سے پیدا کیا ہے۔ ہم اس کو الٹتے پلٹتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے اسے دیکھنے اور سننے والا بنا دیا (اس طرح کہ) ہم نے اسے خیر وشر کی راہ سجھا دی، اب وہ چاہے شکر یا کفر کرے‘‘۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسی مضمون کو سورۂ شمس میں بھی بیان کیا گیا ہے:

وَنَـــفْسٍ وَّمَـــا سَوّٰهَـــا، فَاَلْهَمَهَـا فُجُـــوْرَهَـــا وَتَقْوٰهَـــا، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا. (۹۱: ۷۔۹)

’’نفس اور اس کا سنوارا جانا جیسے سنوارنے کے بعد نیکی و بدی کی راہ سجھا دی گئی، گواہی دیتا ہے کہ جس نے اس کو پاک رکھا وہ مراد کو پا گیا اور جس نے اسے آلودہ کیا، وہ نامراد ہوا۔‘‘

ان آیات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد الست کے علاوہ ہمارے نفس کو بناتے وقت اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر وشر کا سبق بھی سکھا دیا ہے۔ ہماری فطرت کا دوسرا حصہ یہ خیر وشر کا شعور ہے۔ پیدایش ہی کے وقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان دنیوی علوم کے ساتھ جو اس دنیا میں رہنے کے لیے ضروری تھے، یہ علم بھی سکھا دیا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو خیر کا بھی علم ہے اور شر کا بھی۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے صرف شر ہی سکھایا گیا ہو۔ اور نہ کوئی ایسا ہے کہ اسے صرف خیر ہی پڑھایا گیا ہو۔ سب کو دونوں چیزوں کی بصیرت عطا کی گئی ہے تاکہ وہ خارجی ہدایت کے بغیر بھی نیکی کو جانتا ہو، اور اس کے اچھے ہونے سے واقف ہو اور وہ بدی کو جانتا ہو اور اس کے برے ہونے سے واقف ہو۔ خیر وشر کے بارے میں ہمارا امتحان اسی بات پر ہے۔

عہد امانت

اس فطرت کے اندر جیسا کہ ہم نے عرض کیا توحید اور خیر و شر کا علم ہمیں دیا گیا ہے۔ عہد الست ہی کی طرح ایک عہد ہم سے امانت کا لیا گیا ہے۔ تاکہ یہ بات بھی ہماری فطرت کا حصہ بن جائے کہ جو کچھ اقتدار اور حق تصرف ہمیں حاصل ہے وہ اللہ کی ودیعت کردہ امانت ہے جس کا جواب دہ ہمیں ہونا ہے:

اِنَّـا عَـرَضْـنَـا الْاَمَـانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالـجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا، وَاَشْـفَـقْـنَ مِنْهَا، وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ، اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا. (الاحزاب ۳۳:۷۲)

''ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈرے اور انسان نے اسے اٹھالیا، بے شک وہ ستم ایجاد اور جذباتی ہے۔''

اس امانت کے اٹھانے کے بعد یہ چیز بھی ہماری فطرت کا حصہ بن چکی ہے کہ ہم نے خدا کو اس امانت کا حساب دینا ہے۔ یہ امانت خدا نے ہمیں دی ہے۔ وہ اسے واپس لے گا۔ تو اس کے استعمال کا ہم سے پوچھے گا۔ اس سوال کی کیفیت یہ ہے کہ ہمارے سمع و بصر، دل و دماغ اور دیگر صلاحیتوں کے بارے میں بھی باز پرس ہونی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُوْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۶)

''بلاشبہ تمھارے کانوں، آنکھوں اور دل، ان سب سے متعلق تم سے سوال ہوگا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہماری فطرت

یہ تینوں عہد معاہدے ہماری فطرت کی تشکیل کرتے ہیں۔ یعنی عہد الست، خیر و شر کا علم و شعور اور عہد امانت ہماری فطرت کا حصہ ہیں۔ دنیا کا کوئی شخص ان سے محروم و ناواقف نہیں ہے۔ کسی حقیر سی کٹیا میں پیدا ہونے والے بچے سے لے کر شاہی محلات میں پیدا ہونے والے بچے تک دنیا کا ہر شخص اس دولت سے مالا مال ہے۔ اسے خدا نے یہ ہدایات دے رکھی ہیں۔ کوئی شخص ان کے بغیر دنیا میں نہیں آتا۔ اسی فطرت کی آواز ہے کہ اوباش سے اوباش انسان بھی نیکی کی قدر کرتا۔ اور کم از کم دل میں اس کا احساس ضرور رکھتا ہے کہ یہ کوئی بہتر چیز ہے۔

انسان کی یہ سرشت اور ہمارا رویہ

قرآن کی یہ تعلیم ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سب انسان اپنی سرشت میں نیک ہیں۔ اصل میں کوئی بھی فتنہ پسند اور برا

نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے لیے یہ بات کسی طرح درست نہیں ہے کہ ہم انسانوں کے بارے میں، خواہ غیر مسلم ہوں، برے خیالات باندھیں اور انھیں بلا وجہ برا سمجھیں۔ اسی طرح غلطی کھانا، انسان کی توجہ بٹنے اور بھول جانے سے متعلق ہے۔ اس میں لازم نہیں ہے کہ آدمی برا تھا اس لیے اس نے برائی کر ڈالی۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نیکی کرتے ہیں، مگر دوسرے کو اس سے غصہ آ جاتا ہے۔

مثلاً آپ کسی کی مدد کر رہے ہوں، یا قرض ہی دے رہے ہوں اور آپ قرض دیتے وقت اس کے کسی جاننے والے کے سامنے یہ قرض دے دیں تو ہو سکتا ہے کہ قرض لینے والا اس کو پسند نہ کرے۔ مگر آپ کے دل میں بھی کوئی خیال نہ ہو کہ آپ لازماً اسی کے سامنے دینا چاہتے تھے تاکہ اسے اس کے جاننے والے کے سامنے خفت اٹھانے پر مجبور کریں۔ یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی اسی وقت آپ کے پاس آیا جب قرض لینے والے نے آنا تھا۔ لیکن قرض والے کے ذہن میں اس قرض کے لیتے ہوئے اس کی غیرت وحمیت کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

میں نے یہ مثال اس لیے دی ہے کہ ہمارے سامنے یہ بات آئے کہ ہم سے یا دوسروں سے جب کوئی غلطی ہو جائے تو اس سے اس کا ناقص العقل ہونا، یا بد طینت و بدنیت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی معصومیت میں ایسی غلطی کر جاتا ہے جس سے ہمیں ایسا نقصان ہو سکتا ہے، جبکہ غلطی کرنے والے کی نیت نقصان پہنچانے کی نہ ہو۔

اس لیے گمانوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ یقین رکھیں کہ سب انسان اچھے ہیں۔ ان سے اکثر جذبات، بے علمی اور نسیان وخطا سے غلطی ہوتی ہے۔ وہ اپنی سرشت میں برے نہیں ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مطلوب رویہ

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہے کہ انسان اصل میں نیک اور صالح ہے۔ جب تک کہ اس کی برائی ٹھوس دلائل سے ثابت نہ ہو جائے۔ اس روشنی میں قرآن مجید کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کے بارے میں بری بات سامنے آنے کے باوجود اسے دل میں کوئی جگہ نہ دیں۔ اس سے کھلے عام برأت کا اظہار کریں۔ یہ اعلان ہر مومن کے بارے میں ہونا چاہیے۔ اور اس وقت تک ہونا چاہیے جب تک اس کی نیکی ہم پر ظاہر اور اس کی بدی ہم پر پوشیدہ ہے۔ سورۂ نور میں قرآن مجید کا فرمان ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ، ''جو لوگ بہتان گھڑ لائے ہیں، وہ تمھارے ہی اندر کا

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ، بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ، وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيْمٌ، لَوْ لَآ إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا، وَّقَالُوْا هٰذَآ إِفْكٌ مُّبِيْنٌ. (۲۴: ۱۰-۱۲)

ایک گروہ ہے۔تم اس (فتنۂ افک) کو اپنے لیے برا خیال نہ کرو، یہ تو تمھارے لیے بہت اچھا ہے، ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا، وہ اس کے حساب میں پڑا، اور اس فتنے کے سرخیل کے لیے تو بہت بڑی سزا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی، تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے بارے میں نیک گمان کرتے، اور کہہ دیتے ہیں یہ تو صریح بہتان ہے، (ہم اس میں شریک نہیں ہو سکتے)۔''

پہلی بات جو اس آیت سے معلوم ہو رہی ہے کہ دوسروں کے بارے میں دل میں برے خیال لانا تو درکنار اگر کوئی اور شخص بھی کسی کے بارے میں بری بات آپ کے کان میں ڈالے تو قرآن کہتا ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم سب سے پہلے یہ کام کریں کہ ہم اپنے بہن بھائی جن کے بارے میں بھی وہ بات کہی جا رہی ہے اس سے دل میں برا خیال لانے کے بجائے اچھا خیال لائیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن نے 'بانفسھم' کے الفاظ سے یہ بات نمایاں کی ہے کہ تم ان میں سے ہو وہ تم میں سے ہیں۔ تو ایک دوسرے کے بارے میں ایسا کرنے کا مطلب ہے کہ تم اصل میں خود اپنے بارے میں ایسا کر رہے ہو۔ مومنین ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ حدیث کے مطابق سب مومن ایسے ہیں، جیسے ایک جسم کے اجزا، ایک کی تکلیف سب کی تکلیف ہے اسی طرح ایک کی برائی سب کی برائی ہے۔ ہم مسلمانوں کو یک جان ہو کر رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر آج آپ کے سامنے کسی پر الزام لگا ہے تو کل آپ پر لگے گا۔

تیسرے یہ کہ اس طرح کی کسی بات میں جو ثابت شدہ نہیں ہے، اس میں شریک ہونا بہتان لگانے میں شریک ہونا ہے۔ اس لیے بندۂ مومن کو فوراً اس سے گریز کرنا چاہیے اور اس بات کا اعلان کرنا چاہیے کہ کسی بندۂ مومن کے بارے میں یوں کہنا الزام لگانا ہے۔ اس لیے میں تمھاری بات میں شریک نہیں ہو سکتا۔

ہر مسلمان کے ساتھ اصل میں ہمارا تعلق یہی ہے کہ وہ اصل میں نیک ہے اور برائی سے پاک ہے۔ اگر اس کی برائی ثابت ہو گئی ہے تو پھر الگ بات ہے، مگر جب تک برائی ثبوت کے درجے تک نہیں پہنچی اس وقت تک کسی کے بارے میں ایسا سوچنا بدگمانی ہے اور اس کا منہ سے کہہ دینا بہتان ہے۔ یہ دونوں عمل آپ کے حساب میں مندرجہ بالا آیت کے مطابق گناہ کا اضافہ کر دیں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اوپر ہم نے بنیادی مطالبہ کا ذکر کیا ہے، تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ بدگمانی اصل میں کیا ہے، اور دین نے ہمیں اس سے روکا ہے۔ یعنی ہر انسان بنیادی طور پر اچھا سمجھا جانا چاہیے اور دوسروں کو اپنے دل میں یا دوسرے کے سامنے علانیہ برائی کی نسبت دینا گناہ ہے۔ اس سے بچ کر رہنا لازم ہے۔ آیندہ سطور میں ہم ان طریقوں کا ذکر کریں گے جو ہمیں بدگمانی سے بچانے میں مدد دیں گے۔ ان طریقوں کو ہم نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے تاکہ بات کو سمجھنا اور آسان ہو جائے:

۱۔ نظری طریقے

۲۔ عملی طریقے

نظری طریقے

دوسروں کے ہر عمل کو صلاح و خیر پر محمول کرنا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اوپر کی ساری بحث جو ہم نے کی ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ہمارے بہن بھائی، دوست احباب، عزیز و اقارب، قرب و جوار میں رہنے والے سب لوگ ہمارے ساتھ جتنے معاملات کرتے ہیں ۔ ان کو ہم خیر پر محمول کریں۔ اپنے ذہن میں ان کی اچھی توجیہ کریں یعنی یہ سوچیں کہ میرے بھائی نے یہ کام، یہ بات، یہ عمل، یہ حرکت کسی اچھی وجہ سے کی ہو گی۔ اس کا سبب اچھا ہو گا۔

ہمیں یہ اپنی عادت بنا لینی چاہیے کہ ہم ہر کام کی اچھی توجیہ کریں۔ کسی عارف کا قول ہے کہ کسی کے کام کی بری توجیہ کے سو امکان ہوں اور اس کی اچھی توجیہ کا ایک امکان ہو تو تب بھی اچھی توجیہ ہی کرنی چاہیے۔ ہمارے شب و روز میں چند واقعات ہی ایسے ہوتے ہیں، جو ہمیں دوسروں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تو ان کے بارے میں فوراً سوچ کر یہ فیصلہ کریں کہ یہ یقیناً اچھے مقصد ہی کے لیے کیا گیا ہو گا۔

چنانچہ ہمیں اپنے اردگرد رہنے والوں کے تمام

۱۔ اقوال (باتیں اور تبصرے)

۲۔ افعال (کاموں)

۳۔ اشارات (اشارہ بازی)

کو اچھے معنی میں لینا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو یہیں سے بدگمانی کا عمل شروع ہوگا۔ اگرچہ ہم سب کو بات کرتے وقت، حرکات وافعال اور اشارے کرتے وقت اس بات کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ کسی کے لیے اس میں خرابی نہ ہو۔ لیکن جس نے وہ اشارہ برا محسوس کیا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اسے اچھے معنی میں لے۔

ہمارے ساتھیوں اور رشتہ داروں سے جو کچھ صادر ہوتا ہے اگر وہ برائی بھی کر رہا ہے تو آپ کی اچھی توجیہ سے اس کی برائی ختم ہو جائے گی۔ آپ کی تکلیف کم ہو جائے گی اور اس کی برائی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ مثلاً اس نے اگر آپ کو چڑانے کے لیے ایسا کیا ہے، مگر آپ نے اس کی توجیہ اچھی کر لی ہے تو اس کی شرارت ناکام ہو جائے گی۔

غلطی کرنا ایک انسانی وصف

غلطی سب سے ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ 'خلق الانسان ضعیفا'، ''انسان کو کمزور تخلیق کیا گیا ہے۔'' یہ کمزوری اس کے اندر اس لیے رکھی گئی ہے کہ وہ اکڑ کر خدا بننے کی کوشش نہ کرے۔ تکبر میں مبتلا نہ ہو، خدا کے سہارے کو تلاش کرے۔ مگر اسی وصف کی بنا پر اس سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ ہم سب غلطی کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ اکثر ہوتا ہے کہ ہم ہمدردی جتانا چاہتے تھے، مگر اس ہمدردی کے اظہار میں لفظوں کا غلط انتخاب ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ آدمی ناراض ہو جاتا ہے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ سب غلطیاں کرتے ہیں۔ اس لیے جب کسی کی کوئی بات بری لگے تو اس کی ایک وجہ محض یہ بھی ہوتی ہے کہ اس سے غلطی سے ایسا ہوا ہو۔ ہر چیز جو ہمیں تکلیف دیتی ہے لازم نہیں ہے کہ وہ دوسرے نے ہمیں تکلیف دینے ہی کے لیے کی ہو۔ اس میں سو فی صد امکانات اس بات کے ہوتے ہیں کہ اس سے وہ عمل غلطی سے ہو گیا ہو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

غلطی سے برائی ہو جانے کو قرآن مجید نے بھی قابل معافی قرار دیا ہے (البقرہ ۲: ۲۸۶) ہمیں بھی قرآن مجید کی روشنی میں یہ عام اخلاقی ضابطہ اپنانا چاہیے کہ جو کام دوسروں سے غلطی سے ہو جائیں وہ قابل مواخذہ نہ ہوں۔ اس لیے کہ ان کے معاملے میں یہ غلطی کبھی ہم سے بھی ہو سکتی ہے۔

بدگمانی کے موقع پر ہر معاملے میں بدگمانی میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے کہ ہم اگر اس کے قول وفعل کو خیر وصلاح پر محمول نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے یہ غلطی ہو گئی ہوگی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا، مگر اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے ہوں گے۔ وغیرہ۔

بدگمانی ناانصافی ہے

بدگمانی سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی برائی کی شدت آپ پر واضح ہو۔ بدگمانی محض بدگمانی نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں یہ ہمارا اپنے بھائی پر ظلم بھی ہے۔ جس طرح قرآن مجید نے غیبت کو مردہ بھائی کے گوشت نوچنے سے تشبیہ دی ہے۔ اسی طرح اس میں بھی یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ آپ اپنے بھائی کے بارے میں بلا جواز بری رائے قائم کر لیں۔

چنانچہ جب آپ اپنے بھائی کے بارے میں غلط رائے قائم کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ناانصافی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ناانصافی گناہ والا عمل ہے اس سے ہمیں بچ کر رہنا چاہیے۔

بدگمانی نفس کی چغلی

اس جرم کی شناعت اس پہلو سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ بدگمانی اپنی حقیقت میں چغلی اور غیبت جیسی ہے۔ چغلی اور غیبت میں ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ کسی کی برائی کر رہا ہوتا ہے اور اس میں آپ کے ساتھ آپ کا نفس برائی کر رہا ہوتا ہے۔ بدگمانی بھی کسی ایسے نفسیاتی محرک سے شروع ہوتی ہے جس سے چغلی شروع ہوتی ہے۔ آدمی کو اپنے اوپر قابو رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے ساتھ بھی اپنے بھائی کی چغلی نہ کرے۔ بس اتنا ہی اپنے بھائی کے بارے میں سوچے جتنے اس کے پاس حقیقی شواہد موجود ہوں۔ اس کے بعد جب ہمارا ذہن اپنے لام لگانے لگ پڑے تو ہمیں رک جانا چاہیے۔

ایک واقعہ کے کئی رخ

دنیا میں ہونے والے ہر واقعہ کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور کچھ دوسروں کے سامنے۔ ہم بالعموم انھی پہلوؤں کا لحاظ کرتے ہیں، جو ہمارے سامنے ہوتے ہیں، یا ہمیں سمجھ میں آ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ میرے پاس ایک قیمتی چیز تھی، اس کے بارے میں ایک شخص نے یہ پوچھا کہ کتنے کی لی ہے؟ میں نے اس کی قیمت بتا دی۔ دوسرے شخص نے پوچھا کہ کہاں سے لی ہے؟ میں نے کہا کہ تحفہ میں ملی ہے۔ ان دونوں کی کسی ملاقات میں میری اس چیز کا ذکر آ گیا۔ تو دونوں کو میرے جواب میں تضاد نظر آیا۔ اب میرے ہی بیانات سے دو مختلف باتیں ان کے سامنے آتی ہیں۔ جس سے ان کے دل میں میرے جھوٹا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہونے کا خیال آیا۔ان میں سے ایک نے مجھ سے کسی موقع پر پوچھا کہ تم نے اس کے بارے میں دو متضاد بیانات دیے ہیں۔میں نے اسے بتایا کہ یہ دونوں بیانات سچے ہیں۔کیونکہ میرا ایک دوست میرے ساتھ تھا، میں نے جب یہ چیز خریدی تو پیسے اس نے دے دیے تھے۔اب اس کی قیمت بھی مجھے پتا ہے اور یہ میرے لیے تحفہ بھی ہے۔یوں ایک واقعہ سے ہمیں پتا چلا کہ اپنے بیانات کی روشنی میں ایک آدمی جھوٹا لگ رہا ہوتا ہے۔مگر حقیقت میں وہ سچا ہوتا ہے۔اس لیے کہ ہمیں ایک تیسرا اور حقیقی رخ اس واقعہ کا معلوم نہیں ہوتا۔

اس لیے بری رائے بنانے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کے سامنے ایک واقعہ کے بیس پہلو ہیں، مگر وہ حقیقی پہلو آپ کے سامنے موجود ہی نہ ہو جو آپ کی رائے کو مثبت بنا سکتا ہے۔اس لیے جب بھی آپ کے سامنے کوئی واقعہ ہو جو آپ کو منفی رائے بنانے پر اکسا رہا ہو۔تو اسی وقت یہ سوچیں کہ شاید کوئی ایسا رخ اس واقعہ کا ہو جو ہم پر نہ کھلا ہو۔

عملی طریقے

ہم نے نفسیاتی محرکات میں دیکھا کہ ہمارا ذہن ہمہ وقت کام کرتا ہے۔وہ چیزوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ان کا تجزیہ کرتا اور ان میں باہمی رشتہ اور تعلق جوڑتا ہے۔چنانچہ وہ اپنا یہی کام، اگر ہمارے پاس سوچنے کی اچھی چیزیں نہ ہوں، تو وہ ارد گرد رہنے والوں کے متعلق شروع کر دیتا ہے۔ان کے رویوں کی وجوہات تلاش کرتا ہے۔جس کے نتیجہ میں ہم بدگمانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس لیے لازم ہے کہ ہم اپنی سوچوں کو صحیح رخ پر لگائیں۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو کچھ دوسری طرح کی معلومات فراہم کریں تاکہ وہ سوچوں میں ان چیزوں کو لے آئے جو لوگوں سے متعلق نہ ہوں۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

تفکر

عام سوچیں، جیسے کاروبار، سماجی خدمت وغیرہ کے علاوہ کچھ دینی مشاغل بھی ایسے ہیں جنھیں قرآن مجید نے ہمارے سامنے رکھا ہے انھیں اپنانے سے ہمارے ذہن کو اپنی اس فعالیت کے لیے بہتر چیزیں مل جاتی ہیں۔مثلاً قرآن مجید نے تفکر فی آیات اللہ کا حکم دیا ہے۔یہ ذہن کی سب سے اعلیٰ مصروفیت ہے۔اس سے ذہن یقیناً اچھی چیزوں میں غور کرے گا۔ہونے والا ہر واقعہ دراصل خدا کی یاد کو تازہ کرنے اس کی قدرتوں اور حکمتوں کو ہم پر واضح کرنے کے لیے ایک نشانی ہوتا ہے۔وہ ہماری تعلیم اور آزمایش کے لیے ہوتا ہے اگر ہم ان چیزوں کو سمجھیں تو ہر اچھے

برے واقعہ میں ہمارے لیے تفکر اور غور وخوض کا اتنا سامان ہے کہ ہماری بصیرت دن دوگنی رات چگنی ترقی کر سکتی ہے۔ پرانے حکما جن میں لقمان کا نام قرآن مجید نے بھی دیا ہے، انھوں نے جو حکمت حاصل کی وہ کتابیں پڑھ کر حاصل نہیں ہوئی تھی، بلکہ وہ انھی واقعات اور کائنات پر غور وخوض سے حاصل ہوئی تھی۔ اس عادت سے آپ ہر واقعہ میں خدا تک پہنچیں گے نہ کہ دوسروں کی بدگمانی تک۔

احساس امتحان

سوچوں کے اس دھارے کو مزید پاکیزہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہمہ وقت اس احساس کو تازہ رکھیں کہ ہم امتحان میں ہیں۔ اگر ہم اس احساس کو زندہ رکھیں تو ہر قدم پر یہ احساس ہمارا محسن بن کر نمودار ہوگا۔ نہ صرف ہماری سوچوں کو درست رکھے گا، بلکہ ہمارے اعمال کو بھی صحیح نہج پر رکھے گا۔ سورۂ بقرہ میں صحابہ رضوان اللہ علیہم کے بارے میں جو یہ بات آئی ہے کہ 'وبالآخرۃ ھم یوقنون'، 'اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں'۔ یہ اسی بات کا بیان ہے کہ ان کا عمل اور سوچ آخرت کے لیے ہوتی ہے۔ آخرت پر یقین ہی ہے جو ہمیں نیکی پر ابھارتا اور اس پر قائم رکھتا ہے۔ اگر آخرت نہ ہوتو شاید ہم نیکی سے جلد پھر جائیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اپنی اصلاح

اس عادت کو اپنانے کے بعد، ایک اور عادت ہمیں پختہ کرنی چاہیے کہ ہم دوسروں کے بجائے اپنے نفس کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائیں۔ اس کی خامیوں کو تلاش کریں۔ اسے سنواریں، اس کی غلطیوں کو دور کریں۔ ہمیں اپنے نفس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جو اچھے والدین اپنے بچوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کی تربیت کرتے، انھیں آداب سکھاتے، انھیں تعلیم دلاتے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے نفس کے ساتھ یہی کرنا چاہیے۔

جب بھی کوئی غلطی کریں تو ضمیر کی سرزنش کو کافی نہ سمجھیں۔ خدا کے حق میں گناہ کیا ہو، تو توبہ و تلافی کریں، بندوں کے حق میں کیا ہو تو تلافی کریں تلافی نہ کر سکیں تو معاف کرالیں۔ ان چیزوں کو متعین کریں، جن کی وجہ سے وہ غلطی ہوئی تھی۔ یعنی یہ جانیں کہ یہ غلطی بھول چوک سے ہوئی ہے یا کسی نفس کے خبث کی وجہ سے۔ اگر نفس کا کوئی خبث اس غلطی کا سبب ہے، تو اسے درست کرنے کی کوشش کریں۔

بندۂ مومن اپنے اوپر سختی کرنے والا اور دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنے والا ہوتا ہے۔ اسے لوگوں کی

غلطیوں سے زیادہ اپنی غلطیوں سے سروکار ہوتا ہے۔ وہ کوشش میں رہتا ہے کہ اسے صالح بننا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کل قیامت کے دن پکڑا جائے۔

دوسروں سے وجہ پوچھنا

تیسری بات جو آپ کو اپنے سامنے رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جس بات سے آپ کو تکلیف ہوئی اور آپ اس آدمی کے بارے میں، جس نے وہ بات کی ہے، غلط سوچنے لگے ہیں تو بجائے اس کے کہ آپ خود سوچیں اور بلا ثبوت کوئی رائے قائم کریں، بہتر یہ ہے کہ آپ اس آدمی سے اس کی اصل وجہ پوچھ لیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس کی بات کا وہ حقیقی پہلو جو آپ سے پوشیدہ تھا، سامنے آجائے گا۔ جب حقیقت آپ پر کھل جائے گی تو آپ بدگمانی کے بجائے حقیقت پر کھڑے ہو جائیں گے۔

لوگوں کی توجیہ کا اعتبار کرنا

جب آپ اس سے پوچھیں تو وہ جو وجہ بتائے اسے مان لیں۔ اگر آپ کو خیال ہو رہا ہو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے تو مزید تسلی کر لیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کی کہی ہوئی بات کو تسلیم کریں۔ اگر دل ہی دل میں یہ سوچیں کہ اس نے جھوٹ بولا ہے تو یہ پھر وہی بدگمانی ہے، جس سے آپ کو باز رہنا ہے۔

اس دنیا میں سارے لوگ بدطینت نہیں ہیں۔ اور اگر کوئی آدمی جھوٹ بولتا ہے تو یہ لازم نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ ہی جھوٹ بولتا ہو۔ اسی طرح اگر فرض کر لیجیے کہ اس نے آپ کا سامنا نہ کرسکنے کی وجہ سے بات پلٹ لی ہے، تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ کی تکلیف کو رفع کرنے کے لیے یہ بات کافی ہونی چاہیے کہ اس نے اس بات کے اس مفہوم کا اقرار نہیں کیا جو آپ کو تکلیف دے رہا تھا۔

یہ بات اچھی معاشرت کے لیے لازم ہے کہ ہم ایک دوسرے کی باتوں کا اعتبار کریں۔ ان کی توجیہ اور ان کی صفائی میں کہی ہوئی بات کو اہمیت دیں، اور اسے تسلیم کریں۔ ورنہ یہ زندگی ایک عذاب کی صورت میں ڈھلنے لگتی ہے۔ جہاں بھائی بھائی سے نالاں ہوتا ہے، بہن بہن سے، ماں بیٹے سے اور بیٹا ماں سے۔

اگر ایک دوسرے کا یہ اعتبار باقی نہ رہے تو اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا کہ معاشرتی نظام چلتا رہے۔ بات کرنی، سمجھانی اور منوانی اسی صورت ممکن ہے کہ جب لوگوں پر اعتبار باقی رہے۔ ایک دوسرے پر اعتبار کرنا ہی شرف انسانیت ہے۔ یہی حسن معاشرت کی پہلی بنیاد ہے۔ اگر فرض کریں کہ بیوی کو میاں پر اور میاں کو بیوی پر کسی وجہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے شک ہو جائے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس گھر کی صبح صبح نہیں رہے گی اور شام شام نہیں۔ اس لیے اس اعتماد کو اس وقت تک باقی رکھنا چاہیے جب تک ٹھوس ثبوت سے وہ بات ثابت نہ ہو جائے۔

رائے سازی سے پہلے تحقیق

قرآن مجید نے دوسروں کے خلاف اقدام کرنے سے پہلے یہ لازم قرار دیا ہے کہ ہم تحقیق کر لیں (سورۂ حجرات)۔ اس سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ بندۂ مومن اپنے اقدامات میں ایسی حماقت نہیں کرتا کہ وہ جیسے ہی کوئی بات سنے تو فوراً اقدام کر ڈالے اور یہ جانے ہی نہ کہ اصل بات کیا ہے۔

اس تعلیم سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ہر اس عمل میں ہمیں تحقیق کرنی چاہیے جہاں ہم کسی سے کوئی معاملہ کرنے میں غلطی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بدگمانی اگرچہ دل میں ہوتی ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ ہمارے تعلقات، رویوں اور لین دین کے معاملات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم جب کسی کے بارے میں بری رائے بنانے لگیں تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کریں اور اگر بات کی تہہ تک پہنچنے کا موقع نہ ہو تو رائے بھی بری نہ بنایا کریں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بدگمانی کے برخلاف عمل

بدگمانی سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کسی آدمی کے بارے میں آپ کے دل میں برے خیالات پائے جاتے ہیں، تو آپ جب بھی اس سے ملیں، آپ کا رویہ آپ کے خیالات کے الٹ ہونا چاہیے۔ آپ اس سے اچھی رائے رکھنے والے کی طرح ملیں۔ اس سے آپ کو ایک ترفع حاصل ہو گا۔ آپ کی بدگمانی کی حقیقت بے معنی سی ہو کر رہ جائے گی۔ اس سے کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کا دل یہ کہتا ہے کہ تم نے ایسے ہی اسے برا بنا رکھا تھا وہ تو اچھا بھلا شریف آدمی ہے۔

نفس کا تزکیہ

اپنے نفس کو ان بیماریوں سے صاف کر کے رکھنا چاہیے، جو اس بدگمانی کا سبب بنتی ہیں۔ مثلاً حسد، تکبر، حقد و کینہ وغیرہ ایسی بیماریاں ہیں، جو مزید بیماریوں کو پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے انھیں پورے زور سے اپنے اندر سے کھرچ کھرچ کر صاف کر دینا چاہیے۔

اس کے لیے کسی جادو، چلوں یا عملیات کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کا اپنا پختہ اور مضبوط فیصلہ ہے جو کسی بھی بیماری کو ختم کر سکتا ہے اور کسی بھی بیماری کو پنپنے کا موقع دیتا ہے۔ آپ کو پوری قوت ارادی سے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ نے یہ کام آج کے بعد سے نہیں کرنا۔ بس یہی نفس کی ہر بیماری کا علاج ہے۔ ایمان کی دولت بھی اسی فیصلے سے حاصل ہوتی اور اسی فیصلے کی پختگی کی بنا پر ہمارے پاس رہتی ہے۔ کہیں اس فیصلے میں ڈھیلا پن آیا وہیں خرابی شروع ہو جائے گی۔

میری بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اب آپ سے غلطی نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس فیصلے کے فوراً بعد آپ سے غلطی ہو جائے یہ آپ کے فیصلے کی خلاف ورزی ضرور ہے، مگر اس لغزش کو اگلے مواقع پر پختگی کے حصول کے لیے زینہ بنائیں۔ آپ ان شاء اللہ جلد یا بدیر بہتری کی طرف بڑھنے لگیں گے۔ بہتری کی طرف بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں آپ کا فیصلہ زیادہ مستحضر رہنے لگے گا۔ بس یہی وہ چیز ہے، جسے ایمان اور خدا کی یاد کہنا چاہیے۔ جب ایک شخص کو خدا کا خوف یاد رہنے لگے تو وہ تزکیہ کا ایک بڑا سفر طے کر آیا ہے۔ اس نے کہاں بچنا ہے یہی خوف اسے بچائے گا۔ اسے کہاں جھکنا ہے، یہی یاد اسے جھکائے گی۔

اس یاد کو تازہ رکھنے کے لیے قرآن مجید نے دو طرح کی ذمہ داریاں ہم انسانوں کو سونپی ہیں۔ علما پر انذار اور خبردار کر دینے کی ذمہ اری۔ یعنی ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ لوگوں کو آخرت کے بارے میں خبردار کریں۔ انھیں آخرت یاد دلائیں۔ اس ذمہ داری کا دوسرا حصہ 'تواصی بالحق' اور 'تواصی بالصبر' ہے، یہ ذمہ داری ہم عام لوگوں کی ہے، جو عالم دین پر بھی ہے اس لیے کہ وہ اپنی علمی زندگی سے باہر ایک عام آدمی بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دین، اخلاق اور خیر کی وہ معروف و معلوم باتیں جو ساری انسانیت میں مانی ہوئی اور دین اسلام کی جاری کی ہوئی چیزیں ہیں، ان پر آپ ایک دوسرے کو پھسلتے دیکھ کر اور لغزش کے وقت اصلاح کریں۔ یہ وہ تذکیر و نصیحت ہے اگر ہمارے معاشرے میں یا کم از کم ہمارے گھروں میں زندہ عمل بن جائے تو یہ چیز بھی ہمارے تزکیہ میں مدومعاون ہے۔

دوسری ذمہ داری نماز روزہ کا اہتمام ہے۔ قرآن مجید نے نماز کے بارے میں بتایا ہے کہ اسے میری یاد کے لیے پڑھو۔ 'اقم الصلاة لذکری'، یہ وہی یاد ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ یاد ہماری زندگی کے سفر میں ایک نگہبان کی طرح ہے جو ہمیں بھٹکنے سے بچاتی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے نماز کے بارے میں کہا ہے کہ 'ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر' ''نماز ہمیں منکر اور فحشا سے روکتی ہے''۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تسامح اور درگزر

ہم سب انسان ہیں، اور ہم غلطیاں نیت و ارادے سے بھی کرتے ہیں اور تسامح سے بھی۔ نیت اور ارادے کی غلطی قابل مواخذہ ہے۔ جو غلطی نسیان و خطا یعنی تسامح سے ہوئی ہے، وہ قابل معافی ہے۔ ہم آپس میں معاملات کرتے ہوئے اکثر کوئی غلط بات کہہ جاتے یا کر جاتے ہیں، تو جس طرح ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اس غلطی پر ہمیں برا نہ کہا جائے، یہ تو محض غلطی سے ایسا ہوا تھا، اسی طرح ہمیں یہ چاہیے کہ ہم دوسروں کی غلطی پر ان کو ہمیشہ 'برا' قرار نہ دیں۔ بلکہ یہ امکان مانیں کہ اس سے جو غلطی ہوئی ہے وہ بھی تسامح سے ہوئی ہے۔ یہ خیال آپ کے دل میں پیدا ہونے والی بدگمانی کو ختم کر دے گا۔

حسن ظن کی مشق

ہم آپ کو یہ عادت بھی پختہ کر لینی چاہیے کہ اگر ہمارے کسی بھائی کے عمل اور بات کے پیچھے سو شر نظر آ رہے ہوں اور بس ایک امکان خیر کا ہو تو ہمیں خیر کو ترجیح دینی چاہیے۔ اس کی ممارست اور مشق کرنی چاہیے۔ ہمیں روزانہ ایسے بیسیوں معاملات پیش آتے ہیں، جن کو ہمارا دل برا محسوس کرتا اور ہم دوسروں کے بارے میں گمان کرنے لگتے ہیں۔ ان مواقع پر ضروری ہے کہ ہم پوری دل جمعی کے ساتھ ان خیالات کو ذہن سے خارج کریں، اور اگر خارج نہ کر سکتے ہوں تو ان کو اخلاقی طور پر درست رکھیں، تاکہ ہم سے ناانصافی نہ ہو۔ اور ہم اپنے بھائی کے ساتھ حسن سلوک سے محروم نہ ہوں۔ یہ چیز انسان کے لیے اپنے اخلاق کو درست رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کا دل دوسرے کے بارے میں نہایت صاف ہو۔ جو عام طور سے دوسروں کی چغلی و غیبت اور ہمارے برے گمانوں کی وجہ سے صاف نہیں رہتا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خلاصہ

قرآن مجید ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ سب مومن بھائی بھائی بن کر رہیں۔ مگر اس مطالبہ میں بداخلاقی کے دوسرے مظاہر کی طرح بدگمانی بھی ایک نہایت موثر رکاوٹ ہے۔

ہم نے یہ جانا ہے کہ سب انسان اچھے ہیں، سب سے غلطی ہوتی ہے۔ کبھی ارادے سے اور کبھی بھول چوک سے۔ ان سب صورتوں میں ہمیں اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے دوسروں کے بارے میں رائے بنانی ہے۔

اگر ہمارے پاس ثبوت موجود نہ ہوں تو ہمیں رائے بنانے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر ہمارے سامنے بات کا ایک رخ ہو تو دوسرے رخ کو جانے بغیر رائے نہیں بنانی چاہیے۔ اگر ہم اس کے بغیر رائے بنائیں گے تو یہ بدگمانی ہے۔ اور ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔

قرآن مجید کے اس مطالبہ کے لیے کہ ہم بھائی بھائی بن کر رہیں ضروری ہے کہ ہمارے اخلاق اچھے ہوں۔ اخلاق پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا دل دوسروں کے بارے میں صاف رہے۔ اس سلسلے میں لازم ہے کہ ہم دوسروں کے بارے میں اچھا سوچیں اور جو چیزیں برا سوچنے پر مجبور کر رہی ہوں ان کی غلطی کی حقیقت معلوم کریں، ان کی توجیہہ اور پیش کردہ صفائی کو تسلیم کریں۔ یہ سب کچھ ہم اس لیے کریں گے کہ ہم سب پر لازم ہے کہ ہم بھائی بھائی بن کر رہیں۔ یہ رشتہ اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتا، جب تک ہمارے دل دوسروں کے بارے میں صاف نہ ہوں۔ یا ہم خود آگے بڑھ کر حالات کی تحقیق کر کے اپنے دل کو صاف نہ کر لیں۔

بدگمانی ہماری اندرونی حالت کی خرابی سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ حسد و کینہ وغیرہ جیسی بیماریوں پر ہمیں نگاہ رکھنی چاہیے اور بیدار آدمی کی طرح ان کا علاج کرنا چاہیے۔ یہ تزکیۂ نفس کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کی مشق کر کے عادت ڈالنی چاہیے کہ ہم ہمیشہ مثبت رخ سے سوچ سکیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دعا

اللہ تعالیٰ ہمیں بدگمانی جیسی اس بیماری سے بچائے۔ ہمیں ایسا انسان بنا دے جو شکوک و شبہات کے بجائے یقینی باتوں پر عمل کرتا ہو۔ ہمیں دوسروں کی خیر خواہی کی توفیق دے اور دوسروں کے بارے میں اچھے خیالات کی توفیق دے۔